جلد ۹۷ | مئی ۱۹۸۲ء | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودی
- سفینۂ نجات — از جمیل احسن مودودی
- تحریک اسلامی کے ماخذ — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنیوالی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرائیں:

ادارہ ترجمان القرآن ۸-۵ ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اعراض ۱۶۶ موتی چند بلڈنگ انار کلی، لاہور

مکتبہ ترجمان القرآن ۳۰۔ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۷ | مئی ۱۹۸۲ء مطابق رجب ۱۴۰۲ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ـــــــــــ ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

کچھ اور ستارے ٹوٹ گئے

سید نقی علی نے عین اپنے یوم وفات کو میرے نام انگلینڈ سے ایک خط لکھا اور اس میں بتایا کہ "الحمدللہ میری صحت بہت اچھی ہے"۔

اس خط کو قلمبند کرنے کے چند گھنٹے بعد ہی وہ ماورائے افق چلے گئے۔

ایسے رفیقِ تحریک اور دوست کی یاد تازہ کرتے ہوئے میں اپنے امیر میاں طفیل محمد صاحب کے تعزیتی الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

"سید نقی علی مرحوم انتہائی شریف النفس، خدا ترس، شفیق اور تحریکِ اسلامی کے انتہائی مخلص رہنما تھے۔ مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کے ان قدیم ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے دارالاسلام پٹھانکوٹ میں قبل تقسیم مولینا مرحوم کی رفاقت اختیار کی ...... انتہائی نامساعد حالات میں جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی اور آخری سانس تک دینِ حق کی اقامت و اشاعت کے کام میں تندہی سے مصروف رہے"۔

ادھر جناب احسان دانش کا دنیا سے اٹھ جانا بہت باعثِ قلق ہوا، کیونکہ انہوں نے سنگین حالات سے لمبی لڑائی لڑ کر ادنیٰ درجے کی مزدوری سے اپنے آپ کو اٹھایا اور خدا کی مدد سے علم و عزت کے مرتبے تک پہنچایا۔ اس مزدور شاعر کو ترقی پسندوں اور اشتراکیوں نے اپنی طرف کھینچنے کی بہت کوشش کی، مگر اس شخص نے کسی ردِ عمل یا اندھی بغاوت میں پڑے بغیر شعر و ادب میں اسلامی قدروں کو سربلند کرنے کے لیے اپنی ساری کاوشیں وقف کر دیں۔ احسان مرحوم سید مودودی کے محبوں میں سے تھے۔

پھر مولانا محمد متین خطیب، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالرحمٰن لصبار، مولانا جعفر شاہ ندوی اور پیر حسام الدین راشدی جیسی شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ اس موقع پر میرا ذہن امریکہ میں قتل کیے جانے والے تین دوستوں کی پاکستان آنے والی میتوں پر بھی ہے۔ آخر میں اسی ہفتے جدا ہونے والے، لاہور کے پرانے رفیق جناب محمد علی باغبانپورہ (جو دارالعروبہ کے فیض ہمدانی صاحب کے خسر بھی تھے) کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ تازہ ترین غم دینی عالم و محقق جناب منظور احسن عباسی کا رخصت ہونا ہے۔

خدا ان تمام جدا ہونے والوں کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کے زخموں کی چارہ سازی فرمائے۔ (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک مسلم خاتون کا کردار کیا ہونا چاہیے ؟ مسئلہ صاف اور سادہ سا تھا مگر اس کی ڈوریاں بری طرح اُلجھ گئی ہیں۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اپنے خاص عقاید و اقدار اور اصول و احکام رکھتا ہے، لہٰذا جو بھی اسے قبول کرے گا ــــ خواہ وہ حاکم ہو یا شہری، اُستاد ہو یا شاگرد، دولت مند ہو یا غریب، مستاجر ہو یا اجیر، مرد ہو یا عورت ــــ اُس کا کردار دُنیا کے بنائے ہوئے مختلف معاشروں سے الگ اور امتیازی ہوگا۔ اگر یہ امتیازی تشخص نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کو ٹھیک طرح سمجھ کر اُس سے ہم آہنگی پیدا نہیں کی گئی۔ جو فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ سے منسوب ہونے کے باوجود غیر اسلامی تہذیب و معاشرت سے تمام آداب و اطوار لیتا ہے اور سرمستِ تقلید و مرعوبیت ہو جاتا ہے اور خود اس پوزیشن میں نہیں رہتا کہ وہ بیرونی دُنیا کو کچھ نئے انداز و اسالیب دے سکے تو یہ بڑے خسارے کا معاملہ ہے۔

شاید میری کوتاہ نظری ہوگی کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہماری ماڈرن خواتین اور ان کی تنظیم "اپوا" نے کبھی کسی مغربی طور طریقے کو خلافِ اسلام سمجھ کر اُس کے خلاف آواز اُٹھائی ہو، کبھی ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے خواتین کی تربیت کے لیے کوئی خاص کلام کیا ہو، کبھی کسی خلافِ دین رواج یا تقریب یا ادارے کے خلاف احتجاجی قرارداد پاس کی ہو، کبھی اُن کا کوئی وفد اس

مقصد سے کسی حاکم سے طاہو کر ہم فلاں اسلامی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اس میں ہماری مدد کی جائے۔ کبھی پیش کش کی ہو کہ نماز یا زکوٰۃ یا کسی اور سلسلے میں جو اقدامات کیے جا رہے ہیں، ہم اُن کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا تعاون پیش کرتے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فلم، ریڈیو یا ٹیلی وژن پر نسائیت کا کوئی گھٹیا روپ سامنے آنے پر یا سرمایہ کے زور سے خواتین کے چہروں، بدنوں اور جسموں کی خرید و فروخت پر اپوا کی بیگمات نے کوئی مظاہرہ کیا ہو۔

لے دے کے اپنی ملازمتوں کے مساویانہ حق اور اس حق کے ساتھ کسی طرح کی حدود و قیود کو مسترد کرنے پر اپوا زادیاں اُٹھ کھڑی ہوں تو معنی یہ ہوتے کہ جو ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے، اُس کا صرف اپنے مفاد کا پلڑا آپ بھرنا چاہتی ہیں، فرائض اور ذمہ داریوں اور پابندی حدود کا پلڑا چونتیس برس سے خالی ہے۔ ایسی ترازو کے ساتھ آپ سے کون عدل یا اعتدال کی اُمید رکھے گا۔

اس ملک میں بڑی لمبی دستوری جدوجہد ہوتی رہی، کبھی آپ نے اسلامی اصول دستور کے لیے کوئی آواز اُٹھائی؟ یہاں قرارداد مقاصد پاس ہوئی، آپ نے کوئی دلچسپی لی؟ یہاں لوگ آمریتوں تلے پستے رہے، کبھی آپ نے زخم کھانے والی قوم سے کوئی ہمدردی کی؟ یہاں فحاشی نے بارہا زور باندھا ——— اور اس وقت بھی غیر ملکی عریاں تصاویر، کرایہ کے گھٹیا ناولوں اور وی-سی-آر کے پیرائے میں بلیو فلموں کی وبا عام ہو رہی ہے، کبھی آپ نے عورتوں سے تعلق رکھنے والی اس تباہ کن مہم کا نوٹس لیا؟ دکانوں کے شوکیسوں میں جگہ جگہ عورتوں کے مجسمے سجے ہوتے ہیں۔ جن میں اُن کے قابل اخفا حصہ ہائے جسم کو اُبھارا گیا ہے، کبھی آپ نے محسوس کیا کہ یہ عورت کی توہین ہے اور اس لحاظ سے خود آپ کی تحقیر؟ اور پھر کیا کبھی کسی سے یہ مطالبہ کیا کہ عورت کا یہ ناجائز استعمال ختم کر دیا جائے؟

آپ کا سارا زور دو ہی باتوں پر ہے، ایک پردے بلکہ چادر و دوپٹے کی پابندیاں نہ ہوں اور دوسرے مردوں کے ساتھ مخلوط تعلیم، مخلوط تقاریب، مخلوط دفتری زندگی اور دوسری سرگرمیوں میں

دوش بدوش ہو کر رہنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ اور اس پر یہ بھی اصرار کہ یہ عین اسلامی اسلوب ہے اور قرآن اسی کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اگر کوئی مفسر یا مولوی اس اجتہادی نقطہ نظر کو نہ ملتے تو وہ ملا ہے، (اور مغربی استعماریوں نے اس لفظ کو کودن اور احمق کے معنی کا جامہ پہنایا ہے) اُسے بولنے کا حق نہیں، خصوصاً ہمارے شوہروں کے زیر اہتمام چلنے والے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے دروازے تو اُس کے لیے قطعاً بند ہونے چاہئیں۔ کاش کہ اپوا کی بیگمات میں یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قرآن و حدیث کا درس دینے کا اجارہ سنبھال لیتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن و حدیث کی دُنیا میں داخل ہونے والے کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اگر وہ کسی ایک جگہ کوئی ٹیڑھی بات کر بھی لے تو آگے چل کر دوسری آیات و روایات اُس کا راستہ روک دیتی ہیں۔ قرآن کا یہ خاصہ ہے کہ جو اس سے ہم آہنگی کرے نہ کرے، اُسے وہ اُٹھا کے اپنی دُنیا سے باہر پھینک دیتا ہے اور جو اس کے اندر رہنے پر اصرار کرے اُسے وہ آہستہ آہستہ اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ خصوصاً درس دینے والے لوگ تو اگر آیات کے ساتھ سامعین کے رُوبرُو کھیلتے ہیں تو فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ کوئی ادبیت اور لفاظی اُن کو نہیں بچا سکتی۔ بس بیگمات کرام! ہمت ہو تو ذرا قرآن سے معاملہ کر کے دیکھیے، یہ نہیں کہ ایک آدھ آیت یا اس کا کوئی حصہ لیا اور اس پر سارا اجتہاد کھڑا کر دیا۔ آخر یوں رائی سے پربت کب تک بنائے جاتے رہیں گے۔

ابتدائی سطور میں جو بات میں نے اجمالاً لکھی اُس کی قدرے وضاحت کرنا چاہتا ہوں — مُسلم خواتین کی کسی پاکستانی تنظیم کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جہاں دَورِ جمود کے اثرات اور ہندو معاشرت کی مسلط شدہ رسوم کو مٹانے کی فکر کرے، وہاں مغربی تہذیب کے ان فاسد اثرات سے ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو نجات دلانے کی زیادہ سعی کرے جن کا نفوذ انگریزی اقتدار کے ساتھ شروع ہو کر حصولِ آزادی تک ہی خاصا زور پکڑ چکا تھا۔ اور اب تو ان فاسد اثرات کے برگ و بار بڑے زور شور سے نمودار ہو رہے ہیں۔ اس ذمہ داری کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلم عورت کا کردار اس طرح پیش کیا جائے کہ جدید ملحدانہ تہذیب کے بنائے ہوئے معاشرے

کے تصورِ نسائیت سے ہمارا تصورِ نسائیت جداگانہ شکل میں ممیز ہو۔ ہم اصولوں میں اور تفصیلات میں راہِ حق سے ہٹی ہوئی دنیا کو یہ بتا سکیں کہ ہم ایک مختلف قسم کے معاشرے اور ایک مختلف قسم کی تہذیب کے نمائندہ لوگ ہیں اور ہمارے تمہارے راستے ایک نہیں ہیں۔ یہ پست مقام مسلمانوں کا نہیں ہے کہ وہ اپنے دور کے مقلد بن کر ہر شے اس سے قبول کرنے والے ہوں بلکہ "یدِ علیا" کے ساتھ اسے زیادہ بہتر اقدار دینے والے ہوں۔

بتایا جائے کہ آپ لوگوں نے دنیا نئے بے اسلام کو کیا پیغام اور کیا تحفہ نسائیت کے دائرے میں مہیا کیا ہے؟ اگر کچھ نہیں تو پھر آپ وقت کے طوفانی دریا کے تند ریلوں کی گرفت میں آکر بے بس ہیں کہ عالمی مروجات اور پروپیگنڈا جدھر آپ کو بہائے لیے جا رہا ہو۔ اُدھر اس نشہ آور تصور میں بہتی رہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ وقت کے دھاروں میں بے اختیارانہ طور پر اس طرح بہنے اور غوطے کھانے والوں کے لیے اسلام کے پاس سرے سے کوئی دعوت اور کوئی پیغام اور کوئی حکم نہیں ہے۔ اسلام تو اُن لوگوں کو اپناتا ہے جو اسلامی غایات کے مطابق وقت کے دھارے کا رُخ بدلنے کے لیے مہم اُٹھا سکیں۔ اسی لیے وہ دین جہاد ہے —— کلمۂ اول سے لے کر مرحلۂ آخر تک جہاد! جس کسی کو جہادِ اسلام کے مقاصد اور اس کی تحریک کا شعور ہی نہ ہو، اُسے اس تکلف بے جا کی کیا ضرورت کہ وہ اسلام سے باہر کی باتیں چھیڑتے ہوئے بلا کسی شعور کے اسلام کا نام لے یا اُس کے بنیادی نوشتے کی کسی آیت کے کسی جزو کو اُچھالے۔

اسلام آپ کے دفتر میں مہر لگانے والا کلرک نہیں ہے کہ جو چیز آپ کو پسند آ جائے اور جو فیصلہ آپ کر لیں، آپ کا اشارۂ ابرو ہوتے ہی وہ اس پر کھٹ سے مہر لگا دے اور نہ لگائے تو آپ جلوس لے کر مظاہرہ کرنے چڑھ دوڑیں اور محبِ دین افراد کو ملّا کہہ کر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں۔

یہ غلط کھیل بہت عرصے سے اپنے مختلف اذیت رساں مناظر دکھا چکا ہے۔ خدارا اب بساط سمیٹیے اور غلبۂ دین کا کام کرنے والوں کو کام کرنے دیجیے۔ یہ کھیل جو معاشرے کی اکثریت کو ایمانی موقف سے ہٹانے میں ناکام ثابت ہوا ہے، اب ہر ذہین آدمی کو

بور معلوم ہوتا ہے ۔ کوئی دوسرا کرتب شروع کیجیے ۔

مشکل یہ ہوئی کہ آپ لوگوں نے کسی ناپسندیدہ نقطۂ نظر پر دلائل سے بات کرنے کے بجائے ایجی ٹیشن اور دباؤ ڈالنے کا طریقہ اختیار کیا ۔ ٹیلی وژن کے خلاف برسرِعام آپ کا مظاہرہ خلافِ قانون بھی تھا ، اور یہ آپ کے غیر ذمہ دارانہ پن کا ثبوت ہے کہ آپ نے تعلیم یافتہ ہو کر ہی نہیں ، انتظامیہ کے کارپردازوں کی بیگمات ہوتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی ، جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات قانون کی حدود کی پابندی قبول نہیں کر سکتے ـــــ کجا کہ اسلام کے اُصول و احکام کی پابندی !

آپ نے ذہنوں کو بدلنے کی استدلالی محنت سے کام نہیں لیا ۔ قرآن کی بات تھی تو آپ قرآن کی آیات سے مدد لیتیں ۔ احکامِ رسالتؐ کا ذکر چلا تھا تو آپ اپنے حق میں سنّتِ نبویؐ اور احادیثِ پاک کو لاتیں ۔ آپ حضورؐ کی تیار کردہ سوسائٹی کے ثابت شدہ معمولات کو اُجاگر کرتیں ، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل اور خود امہات المومنینؓ اور صحابیاتِ محترمات کے قائم کردہ نمونوں کو پیش فرماتیں ۔ اور آپ ائمہ فقہا کی علمی تحقیقاتوں سے تائید حاصل کرتیں ، مگر آپ نے ایجی ٹیشن کے ذریعے حکومت کی جبری قوت کو اپنی مدد کے لیے بلایا ۔ اس ایجی ٹیشن کی سربراہی ایک ایسی شخصیت نے کی جو ایک بڑے صاحب کی بیگم تھیں ۔ اگر ایسا واقعہ دورِ فاروقی میں ہوتا تو خلیفۂ ثانی اپنی اہلیہ کے خلاف کارروائی کرتے اور اُسے حوالۂ عدالت کر کے سزا دلواتے ۔

بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں کی بیگمات اور ان کی تنظیم نے ابھی تک تو کوئی ایک مثال بھی ایسی قائم نہیں کی کہ وہ معاشرے میں کسی خلافِ اسلام سرگرمی کو دیکھ کر ایجی ٹیشن کرتیں ۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں کی اعلیٰ خواتین تو اُس مقام تک بھی نہیں پہنچیں جہاں تک انڈیا کی پہلا میں جا پہنچیں انہوں نے بازاروں میں عورتوں کی عریاں تصاویر اور فحاشی کے خلاف دلی میں ایجی ٹیشن کیا اور یہ صورت چند سال پہلے بھی وہاں عمل میں آچکی ہے ۔ اگر ہمارے ہاں کی بیگمات نے بھی کبھی ایسا کوئی ایجی ٹیشن کیا ہوتا تو اُن کا مقام اعتبار برتر ہوتا ۔ اسلام سے آزاد ہو کر چلنے کے لیے تو اسلام کے

نام پر آواز اُٹھائی جاتی ہے ، مگر اسلام کے احکام و حدود کی پابندی قبول کرنے کے لیے کوئی آواز ماڈرن حلقوں سے بلند نہیں ہوتی ۔ یعنی آپ جو کچھ چاہیں اُس کی منظوری تو اسلام (نعوذ باللہ) بصد ادب دیتا رہے ، لیکن اسلام جو تقاضے کرتا ہو، اُن کی آپ کچھ پروا نہ کریں ، حالانکہ اسلام تو نام ہی اس کا ہے کہ خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے سامنے سرِ تسلیم بغیر کسی تحفظ کے خم کر دیا جائے ۔

ایک اہم معاملہ اور بھی ایسا ہے جو بہت غور و توجہ چاہتا ہے ۔

اس وقت پوری دُنیا میں ، خصوصاً مسلم معاشروں میں ملحدانہ افکار و معاشرت کے خلاف اسلامی نظریہ و نظام کی علمبردار قوتوں کی تند و تیز کشمکش شروع ہو چکی ہے ۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ آہستہ آہستہ فیصلہ کُن مراحل کی طرف بڑھ رہی ہے ۔ اس کشمکش میں اسلام کی تمام دشمن اور مخالف قوتیں —— وہ بڑی عالمی قوتیں ہوں ، یا یہود و ہنود کی قوتیں —— پورا زور لگا رہی ہیں کہ مسلمان موجودہ تہذیبی سامراج کے چنگل سے نہ نکل سکیں ۔ اس لڑائی میں ملحدانہ عالمی تہذیب کی پشتیبان قوتیں افکار، علوم ، نصابیات ، صحافت ، عالمی نیوز ایجنسیوں کے نظام ، فلم ، تصاویر ، ٹیلی وژن ، ریڈیو ، ثقافتی وفود ، ایڈ اور پروپیگنڈے کے پورے وسائل کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مسلم معاشروں کے اندر جن عناصر کو مضبوط رکھنا چاہتی ہیں ، اُن میں سے ایک مسلمانوں میں گھلا ملا لادینیت پسند طبقہ ہے اور دوسرے ماڈرن بیگمات ۔

لادینیت پسند طبقے کا ایک حصہ حکومت و اختیار کی قوتوں اور انتظامی عہدوں کی قوت کو کام میں لاکر اور دوسرا حصہ ادب و صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ میں نفوذ کر کے اسلام کی پیش قدمی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے ۔ اسی مزاحم قوت کی وجہ سے اوّل تو اسلام کا نام گونجتے رہنے پر بھی کام کچھ نہیں ہو سکتا ، کچھ کام ہو بھی تو اس میں ہزار رخنے پیدا ہوتے ہیں ، یا پھر جو قدم اسلام کی راہ پر اُٹھتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے کئی قدم اسلام کے خلاف عملاً اُٹھ جاتے ہیں ۔ نتیجہ تضاد ہے ۔ اس طرح عوام کے اسلامی جذبات کو تضاد کی چکی میں پیسا جا سکتا ہے ، اور پیسا

(باقی بر صفحہ ۵۵)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

جناب عاصم نعمانی کی ڈائری سے اقتباس

مولینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحی اور تحریکی زندگی کی عکاسی کے لحاظ سے ۵ - اے ذیلدار پارک میں آنے والے مہمانوں کی مولینا سے گفتگو میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں - بعض کا تعلق عصرانہ مجالس سے ہے اور بعض دوسرے اوقات سے متعلق ہیں - عاصم نعمانی صاحب نے ایسے مواقعِ فیض کا کچھ نہ کچھ حصّہ محفوظ کر لیا ہے۔ آج ہم اُن کی ڈائری کے کچھ اوراق پیش کر رہے ہیں - (ن - ص)

۶ رجون ۷۵ء

آج جڑانوالہ سے تیس چالیس معززین پر مشتمل ایک وفد مولانا محترم سے ملنے کے لیے آیا۔ دس بجے صبح مولانا کی قیام گاہ پر کوئی ایک گھنٹہ ان سے گفتگو ہوتی رہی - مولانا نے ان کے سوالوں کے جوابات دیے - پہلا سوال یہ تھا کہ غیر جمہوری فضا میں تحریک اسلامی کے لیے کیا امکان ہے ؟

مولانا محترم نے فرمایا، کہ جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے ساتھ لے کر کھڑے ہوں اور سمت سے سخت ظلم و ستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اور دعوت کی معقولیت و صداقت اپنی فطری طاقت سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے - اس تحریک کے مخالف اس کے کارکنوں پر جتنا ظلم کرتے ہیں اتنے ہی وہ ملک کے رہنے والے

شریف النفس اور نیک طبع لوگوں کی نظر سے گرتے چلے جاتے ہیں اور اُن کے مقابلے میں تحریک کے کارکن جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی کی راہ سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اتنی ہی اُن کی قدر و منزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب فیصلہ کُن مقابلے کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر اُن لوگوں کی ہمدردیاں کارکنوں کے کام آتی ہیں جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے تھے مگر دل سے اس دعوت کے حامی تھے۔ یہاں تک چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں جن کا ساتھ دینا تو درکنار ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

یہ وہ سبق ہے جو ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہو جانے اور بنیادی حقوق کچل دیے جانے پر ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ کام کی نئی راہیں تلاش کر کے اپنی منزل کی طرف پیش قدمی جاری رکھنی چاہیے۔

ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ پڑھے لکھے لوگ، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوان بڑی حد تک ہماری دعوت کو سمجھ چکے ہیں۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ عوام الناس کے اندر پھیل کر اُس زبان میں یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کریں جسے وہ سمجھ سکتے ہوں اور انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس کام میں بڑی مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ عوام کو جھوٹے دعووں اور پُرفریب باتوں سے دھوکا کھانے کی عادت ڈال دی گئی ہے جسے چھڑانا سخت محنت طلب کام ہے۔ ایک فریبی سے تلخ تجربات اُٹھا کر وہ اس سے بیزار ہو بھی جائیں، تو کسی دوسرے فریبی سے دھوکا کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور کوئی اگر سبز باغ دکھانے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ ایسا پروگرام اُن کے سامنے پیش کرے جو حقیقت پر مبنی ہو تو اُس کی باتیں اُن کے دل کو نہیں لگتیں۔ اس حالت میں محض کامیابی کو اپنا مقصود بنانے والے تو ایک فریب کار گروہ کو شکست دینے کے لیے اس سے بڑھ کر فریب کاری کرنے پر اُتر آتے ہیں، مگر جن لوگوں

کو ملک کی اصلاح کرنی ہے، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ صبر کے ساتھ آہستہ آہستہ عوام کی اس بُری عادت کو بدلنے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ غالب امکان اسی بات کا ہے کہ بے دریغ تلخ تجربات اُٹھانے کے بعد آخر کار ان لوگوں کو عقل آجائے گی اور یہ معقول باتیں سُننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے دھوکے ہی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہو تو پھر بہتر یہی ہے کہ اُن کی یہ خدمت دوسرے لوگ ہی انجام دیتے رہیں۔ ہمیں بہرحال خدا کے ہاں اپنا نام فریب کاروں میں نہیں لکھوانا۔

ایک اور سوال کے جواب میں کامیابی کے صحیح تصوّر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے قرآنِ پاک سے حضرت لُوط علیہ السلام کی مثال دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سالہا سال اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے مگر اس قوم کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی دعوتِ اصلاح قبول نہ کی، حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو پورے ملک میں اہلِ ایمان کا صرف ایک گھر پایا جاتا تھا، اور وہ گھر خود حضرت لوط علیہ السلام کا تھا، اور اس میں بھی ان کی اپنی بیوی ایمان لانے والی نہ تھی۔ اب کیا یہ کہا جائے گا کہ حضرت لوطؑ ناکام ہو گئے؟ نہیں، بلکہ ناکام وہ قوم ہوئی جس نے اُن کی بات نہیں مانی، وہ بہرحال کامیاب تھے، کیونکہ انہوں نے اپنا فرض پوری طرح انجام دے دیا۔ اس مثال سے کامیابی و ناکامی کا اسلامی تصوّر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، حق کی دعوت کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک پیش کرتے چلے جانا ہی ایک حق پرست انسان کی اصل کامیابی ہے۔ قوم اگر اس حق کو قبول کرلے جسے وہ پیش کر رہا ہے تو قوم بھی کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ اسے رد کر کے باطل کے پیچھے چل پڑے تو ناکام وہ ہوگی نہ کہ وہ شخص جو اُسے حق کی طرف بُلا رہا تھا۔ البتہ اگر وہ دُنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر خود حق سے منحرف ہو جائے اور ہر طرح کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے تو چاہے دُنیا کی ساری کامیابیاں اسے حاصل ہو جائیں، خدا کے ہاں وہ یقیناً ناکام و نامراد ہو کر رہے گا۔

پاکستان کی اسمبلیوں سے حزبِ اختلاف کے بائیکاٹ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ دُنیا میں جہاں بھی پارلیمانی طرزِ حکومت رائج ہے وہاں

اکثریت ہی حکومت کرتی ہے اور اقلیت حزبِ اختلاف بن کر رہتی ہے۔ لیکن یہ مثال پیش کرنے کا شرف پہلی مرتبہ ہمارے ملک ہی کو حاصل ہوا ہے کہ اکثریت نے اقلیت کو تنگ کرنے کرتے اتنا بے بس کر دیا کہ آخر کار وہ بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کارِ خیر کا اصل مقصد اب کھل کر زبانوں پر آرہا ہے کہ اقلیت اسمبلی کی نشستیں خالی کرے، تاکہ ضمنی انتخابات اور آزاد کشمیر کے انتخابات سے جو "گراں قدر" تجربات حاصل ہوئے ہیں، اُن سے کام لے کر پوری اسمبلی اکثریت کی اسمبلی ہو جائے اور حزبِ اختلاف کے خرخشے سے مستقل نجات حاصل کر لی جائے۔ آخر اس سے زیادہ مثالی پارلیمانی نظام اور کونسا ہو سکتا ہے، جس میں ہر مسودہ قانون پیش ہوتے ہی پاس ہوتا چلا جائے اور مہینوں کا کام ایک دو دن ہی میں انجام دے کر فراغت حاصل کر لی جائے۔

اِن حالات میں ملک سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے اندر پیدا ہونے والی مایوسی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ میرے پاس تو مایوسی آج تک کبھی نہیں پھٹکی، بلکہ یہ لفظ میری لغت ہی سے خارج ہے۔ دوسرے لوگ جو مایوس ہو رہے ہیں اُن سے بھی میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیشہ اللہ سے اچھی اُمیدیں رکھتے ہوئے حق و صداقت کو سربلند کرنے کے لیے جان توڑ جدوجہد کرتے چلے جاؤ۔ اپنی طرف سے کوشش کا حق پوری طرح ادا کر دینے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمہاری خدمت کے نتائج تمہارے جیتے جی ہی برآمد ہو جائیں۔ تم اگر ایک حق پرست کی طرح اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مر بھی جاؤ تو تمہاری حیثیت اس شخص کی سی ہوگی جو حج کے لیے گھر سے نکلے اور دورانِ سفر ہی اُس کی زندگی کا آخری وقت آجائے۔ جس طرح وہ حج کے ثواب سے محروم نہ رہے گا اسی طرح تم بھی راہ حق کی جدوجہد کے ثواب سے محروم نہ رہو گے۔

۱۷ جون ۷۵ء

آج کی مجلس میں خواب کی تعبیر کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولانا محترم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام

کے خوابوں کے سوا اور کسی کا خواب حجت نہیں ہے۔ اس پر اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا:-

حیدرآباد (دکن) میں ایک بڑے قابل وکیل تھے جو بعد میں جج بھی ہو گئے تھے۔ قادیانی ہو گئے تھے۔ میری ان سے رسم و راہ تھی۔ ایک روز میں نے اُن سے قادیانی ہو جانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مرزا صاحب حضورؐ کی گود میں بیٹھے ہیں۔ اِس کے بعد میں کیوں مرزا صاحب کو نبی نہ مانوں۔ اس بات سے بہت گفتگو ہوئی۔ بہت سمجھایا جس پر وہ خاموش ہو گئے، مگر قادیانیت سے تائب نہ ہوئے[1]

۱۸ر جون ۱۹۷۵ء

سوال تھا کہ تحریکِ اقامتِ دین کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟

مولانا نے فرمایا کہ دینی معلومات گو پہلے سے تھیں مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔ چونکہ بچپن

---

[1] ہر قسم کے خوابوں کے متعلق علمائے شریعت کا متفقہ اُصول یہ ہے کہ اگر کسی خواب سے کسی خلافِ اسلام امر کی دعوت ملتی ہو، یا صریحاً کسی گمراہ آدمی کی توقیر ہوتی ہو (خصوصاً ایسا شخص جو بنیادی عقاید — توحید، رسالت اور آخرت — میں کوئی رخنہ پیدا کرے یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے) تو ایسے کسی بھی خواب کو کتاب و سنّت کے مقابلے میں قبول نہیں کیا جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ اُس نے حضورؐ کو خواب میں یہ کہتے یا یہ کرتے دیکھا ہے تو اگر کوئی خلاف شریعت بات سامنے آتی ہے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو وہ شخص غلط بیانی کر کے اپنے گمراہانہ خیالات کو مقبول بنانا چاہتا ہے، یا اگر وہ خود مغالطہ زدہ ہے تو حقیقت یوں ہے کہ اگرچہ شیطان یقیناً حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل اختیار نہیں کر سکتا، مگر وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ کوئی اور پُر تقدس ہیئت اختیار کر کے یہ ظاہر کرے کہ میں ہوں سردارِ اُمت (نعوذ باللہ)

پس تمام خوابوں اور ہر قسم کے کشف کی جانچ کا معیار کتاب و سنّت کے واضح کردہ اساسی عقاید اور قوانینِ معیشت و معاشرت اور ضابطہ ہائے حِلّت و حرمت اور اخلاقی اُصول ہیں۔ (ن ر ص)

میں عربی پڑھی تھی اس لیے جب ذہنی شعور کچھ پختہ ہوا تو خود براہ راست قرآن کریم اور عربی تفاسیر کا مطالعہ کیا جس سے آہستہ آہستہ اقامتِ دین کا تصور پختہ ہوتا گیا۔

جو قرآن کریم والد محترم کے زیرِ تلاوت رہتا تھا۔ وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے حاشیے پر والد محترم کے نوٹس بھی ہیں اور میں نے بھی بہت سے نوٹس اس پر لکھ رکھے ہیں۔

ایک سوال تھا کہ زمانہ طالب علمی میں آپ کوئی کھیل بھی کھیلتے تھے ؟

فرمایا : جی ہاں، فٹ بال، کرکٹ اور جمناسٹک کھیل کرتا تھا۔ مگر اب اُن کے قواعد و ضوابط بھول چکا ہوں۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

رسول اکرمؐ کا معیارِ زندگی

جناب سیّد اسعد گیلانی صاحب

(۳)

دنیوی ضروریات کا معیار چنانچہ حضورؐ نے دنیا اور اُس سے استفادہ کا معیار بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جو شخص اپنی جماعت میں امن و سکون سے زندگی بسر کرے اچھی و تندرست ہو۔ اُس کے پاس ایک دن کی غذا رکھی ہو تو بس گویا اُس نے ساری دنیا حاصل کر لی"۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا:

"انسان کو ان اشیاء کے علاوہ اور کسی چیز کی حاجت نہیں ہے، اپنے رہنے کے لیے گھر، بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، کھانے کے لیے خشک روٹی اور پینے کے لیے پانی"۔

ایک شخص نے حضرت عمروؓ بن عاص سے پوچھا جنہوں نے حضورؐ کی صحبت پائی اور تربیت حاصل کی تھی، کیا ہم فقراء میں سے ہیں؟ انہوں نے کہا: کیا تیری بیوی ہے؟ اُس نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا کیا تیرے رہنے کے لیے گھر ہے؟ کہا ہاں، انہوں نے کہا تب تو تو اغنیا میں سے ہے۔ پھر اُس نے کہا، میرے پاس ایک خادم بھی ہے یہ سُن کر انہوں نے کہا اچھا پھر تو تو بادشاہ ہے۔

صحابہؓ میں سے کسی نے سوال کیا۔

"یا رسول اللہ! سوال نہ کرنے کے لیے کتنے مال کی ضرورت ہے" حضورؐ نے فرمایا "جس کے پاس صبح و شام کا کھانا موجود ہو"۔

حضرت عمرؓ کو ایک ریشمی رنگین کپڑا ملا تو اُسے حضورِ اکرمؐ کے پاس لے گئے اور عرض کیا۔

دربار رسول اللہ آپؐ اسے لے لیجیے، عید اور دیگر اہم مواقع اور وفود کی آمد پر اسے زیب تن فرمائیے"۔ آپؐ نے فرمایا:

"یہ لباس تو اُس شخص کے لیے سزاوار ہے جس کا قیامت میں کوئی حصہ نہیں"۔

آپ کی سخاوت و عطا کا یہ عالم تھا کہ مال کی آمد سے صحن بھر جاتا تھا۔ آپ سارا مال لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور جب گھر میں تشریف لاتے تو کھجور کے درخت کی پھوس کے تکیے پر آرام فرماتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ کے پاس ایک ہی چادر تھی جس کو رات کو تہہ کر کے اُس پہ نماز پڑھتے۔ دن میں اُسے کھول کر بچھا لیتے اور اُس پہ اجلاس فرماتے۔ کھانے میں سخت محتاط اور قناعت پسند تھے۔ فرماتے:

"انسان کو چند لقمے کافی ہیں تاکہ اُس کی آنتیں سیدھی ہو جائیں"۔

حضور اکرمؐ نے اپنی مرضِ وفات میں فرمایا:

"اے عائشہؓ وہ سونا کیا ہوا"۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس حاضر کیا گیا جو پانچ یا سات دینار کے قریب تھا۔ آپؐ اس کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا خیال یہ نہ تھا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ دینار میرے پاس ہوں۔ اے عائشہؓ ان کو خیرات دو، چنانچہ وہ تقسیم کر دیے گئے۔

اسلامی مملکت کے اس سربراہ نے جو گھر میں اثاثہ چھوڑا وہ یہ تھا:

- کچھ ہتھیار، زرہ، کمانیں، تیر اور ڈھال یہ جہاد فی سبیل اللہ کا سامان تھا جو موجود رکھا جاتا تھا۔
- ایک عصا
- ایک لکڑی کا پیالہ، ایک شیشے کا پیالہ۔
- ایک پانی کا مشکیزہ، وضو کا برتن، کپڑے دھونے کا برتن، ہاتھ دھونے کا برتن۔
- تیل کی شیشی، آئینہ اور کنگھا ایک سرمہ دانی، قینچی، مسواک۔
- ایک بڑا پیالہ جسے کنڈا لگا تھا زیادہ مہمانوں کے لیے۔
- ایک چارپائی اور ایک چمڑے کا بستر۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں اللہ کے رسول کے ترکہ میں نہ دینار تھا، نہ درہم، نہ بکری، نہ اونٹ۔ اور عمر بن حارث کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے ترکہ میں سوائے ہتھیاروں اور ایک خچر کے کچھ نہ چھوڑا۔ تھوڑی سی زمین تھی جو صدقہ کر دی گئی تھی۔

یہ اس انسان کے فقر کا حال ہے جو دلوں کا بادشاہ، علاقوں کا حکمران، سرداروں کا سردار اور بادشاہوں کا شہنشاہ تھا، جس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیل گئی تھی۔ آپ کا فقر و غنا کا یہ طرزِ عمل اپنے مالک کی منشا اور رضا کے عین مطابق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اس لیے اشرف قرار دیا ہے کہ وہ اپنے فہم و شعور اور عزم و ارادے کے ساتھ اللہ کی ...... بندگی کا قصد کرتا ہے اور انسانوں میں سے انبیائے کرام اس لیے محبوب ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اللہ کی رضا کی خاطر دُنیا کے ان تمام دلفریب نہ دلکش اور پُرکشش تعیشات اور سہولتوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں جو انہیں آسانی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ خوش حالی اور مال و دولت پرورشِ نفس کا ذریعہ اور آرام طلبی اور عیش پسندی کا آلہ ہے اور عیش پسند خوش حال لوگ ہی خدا کی بندگی اور راہ راست پر آنے سے ہمیشہ کتراتے اور صداقت و دیانت کے راستے کے رہزن ثابت ہوتے ہیں۔ تمام انبیاء کے ساتھیوں کی طرح حضورؐ اکرم پر بھی غربا و مساکین اور کم مالی حیثیت کے لوگ جلد اور پہلے ایمان لائے اور سردارانِ قریش اور مال دار خوش حال لوگ ہمیشہ رکاوٹ ڈالتے رہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو خالقِ خواص اشیا ہے فرماتا ہے:

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا۔ إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا۔ (المزمل ۱۱-۱۳)

ترجمہ: "ان جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت میں رہنے دو۔ ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔"

اور یہ بات صرف حضورؐ کے مخاطب خوشحال لوگوں پر ہی صادق نہیں آتی۔ بلکہ ہر نبی کو انہی سرمایہ دار اور خوش حال دُنیا کے طالب اور عیش و عشرت میں مبتلا لوگوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت نوحؑ نے ان خوش حال اور مالدار لوگوں کی شدید مزاحمت سے تنگ آ کر کہا۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا۔ (نوح - ۲۱)

ترجمہ: نوحؑ نے کہا " میرے رب انہوں نے میری بات رد کر دی اور اُن مالداروں اور رؤسا کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔"

سونا چاندی — راہ حق کے سنگ ہائے گراں | حضرت ابراہیمؑ کو بھی اپنے ملک کے بادشاہ اور رؤسا سے ہی سابقہ پڑا اور انہوں نے ہی دعوت کو جھٹلا کر اور انہیں آگ میں ڈال کر اپنا ناپاک دل ٹھنڈا کرنا چاہا۔ اس لیے کہ دعوتِ حق وہ پیمانۂ عزو شرف مقرر کرتی ہے جو دُنیا داروں کے عام پیمانہ عزو شرف، مال و دولت کو اُلٹ کر ایمان اور عمل صالح کو عزت و شرف کا پیمانہ قرار دیتی ہے۔ بس یہی بات خوش حال طبقے کو ناگوار ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ کو بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ہی واسطہ پڑا جو حکام اور رؤسا تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کو بھی رؤسا اور حکام نے ہی صلیب تک پہنچایا۔ حضرت یحییٰ کا سر بھی ایک بادشاہ نے ہی کاٹ کر طشت میں رکھ کر اپنی محبوبہ رقاصہ کے سامنے پیش کیا۔ غرض تاریخِ انسانیت میں جہاں جہاں دعوتِ حق بلند ہوئی ہے۔ وہاں مالدار لوگ، رؤسائے قوم، ملاءِ ملت اور خوش حال مالدار اور دُنیا دار لوگ اس دعوت کی مزاحمت و مخالفت کے لیے آگے بڑھتے رہے ہیں اور ساتھ دینے والوں میں اکثریت مساکین، فقراء اور تہی دست لبس ماندہ لوگوں کی ہی رہی ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ مال و دولت اور سروسامانِ دُنیا دل پہ ایک ایسا زنگ چڑھا دیتا ہے جس میں سے دعوتِ حق کی شعاعیں آسانی سے نہیں گزرتیں اس کے مقابلے میں غربت، فقر اور دُنیا کے مال سے تہی دستی انسان میں خدا سے تعلق، رقتِ قلب اور ایسا جذبِ اندروں پیدا کر دیتی ہے جو دعوتِ حق کو شناخت کرنے اور قبول کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

اس مال و دولت اور سرمایہ و سروسامانِ دُنیا کی افراط نے بڑے بڑے فساد پیدا کیے اور بڑی بڑی آفتیں ڈھائی ہیں۔ قومیں قوموں سے جنگیں برپا کرتی ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں انسان ہلاک ہوتے، بچے یتیم ہوتے، عورتیں بیوہ ہوتیں اور بستیاں ویران و شکست حال ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ مال و دولت

کے حصول، دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے کی حرص، نفس پرستی، مفاد پرستی اور قوم پرستی کی خاطر ہوتا ہے۔ دُنیا میں ظلم و ستم، حق تلفی اور حق ماری، زیردست آزاری، طبقاتی کشمکش، نزاع و اختلاف، اشرف المخلوقات کے ان سب کارناموں کے پیچھے ہوسِ مال و دولت اور عیش و آرام، غلبہ و تفوق کی خواہش اور نفسیاتی لذتوں کا حصول ہوتا ہے اور یہ سب دُنیا کے وہ مظاہر ہیں جو انسان کے نفس کو آسودہ کرتے اور اُس کی رُوح کو مضمحل کرتے ہیں۔

شہنشاہِ فقر

اسی لیے تمام انبیائے کرام اور پھر حضورؐ اکرم نے بطورِ خاص دُنیا اور اس کی لذات و خواہشات اور لوازمات و معیارات کو اپنے زیرِ پشت پا رکھا اور انہیں اپنے سامنے سر نہ اُٹھانے دیا کہ یہی فساد کی جڑ اور قوموں کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ قومیں جب تباہ ہوتی ہیں تو پہلے اُن کے خوشحال طبقے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور پھر اُن کا بگاڑ بتدریج ساری قوم میں زہر کی مانند سرایت کر جاتا ہے۔ یہ زہرِ عیش و عشرت جس قوم میں سرایت کر جائے اُسے تباہی و بربادی سے پھر کوئی حکمت روک نہیں سکتی۔ اِسی لیے حضورؐ نے حفظِ ما تقدم کے طور پر خود اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تدبیر کے تحت ہی دُنیا اور اُس کے آرام و راحت اور مال و دولت سے اپنے آپ کو پاک صاف رکھا اور اپنے نفس پر ضبط و خشیتِ الٰہی کا وہ بند باندھا کہ جس کے سامنے مال و دولت کے بہتے ہوئے دھارے اور فتوحات کے سرمایے اور خزانے ٹھیکریوں کے ڈھیر سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ دُنیا کے سب سے بڑے انسان کی بے نفسی اور دُنیا سے استغنا کا ذکر کرتے ہوئے، ایک مشہور سیرت نگار نے کیا خوب لکھا ہے:-

"ضبطِ نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام مُلک کا بادشاہ ہو گیا، اُس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھونس کے چھپر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گذرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اسے تامل نہ تھا۔ آخر وقت تک اُس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ ترفع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بُو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا۔ اُن کے دُکھ درد

میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اسی جیسا ایک انسان ہے۔ تمام عمر کی جدوجہد میں اُس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے پیروؤں پر اُس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اُس کے پیرو اُس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں۔"[۱]

یہ تھا حضورؐ اکرم کی بے نفسی، بے لوثی اور بے نیازی کا عالم، آپ فقر کے شہنشاہ اور استغناء کا پہاڑ تھے اور یہ سب اپنے مالک کی رضا اور اُس کے حکم کے مطابق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کو انہیں لوگوں نے فتح کیا، جنہوں نے استغنا کے زور سے پہلے اسے مغلوب کیا، اور اسے اپنے در کی لونڈی بنا کر رکھا۔ دُنیا کو ایسے انسانوں کی تلاش کبھی نہیں رہی ہے، جو اس سے مغلوب ہو کر اس کے دروازے پر کتوں کی طرح پڑے رہیں۔ اسے تو ہمیشہ تاریخ انسانی میں صرف ایسے انسانوں کی تلاش رہی ہے جو اس سے مستغنی ہوں تاکہ وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرے۔ اسی لیے آج حضورؐ اکرم کے سارے سیرت نگار یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ اکرم کا جوتا بھی ساری دُنیا کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہے۔

---

[۱] نبوتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

حقیقتِ تصوّف

پروفیسر طیّب شاہین لودھی صاحب

(۴)

صوفیہ کا نظریۂ فنا و بقا

بہت سے علماء اور بعض مستشرقین (خصوصاً نکلسن) کا خیال ہے کہ صوفیہ کا نظریۂ فنا ہندی الاصل ہے، جسے سب سے پہلے ابو یزید بسطامیؒ نے پیش کیا تھا، اور انہوں نے ابو علی سندھیؒ سے لیا تھا۔[۱] اکثر صوفیہ فنا کو منزلِ مقصود قرار دیتے ہیں۔ بعض صوفیہ اُسے سلوک کی انتہا اور منزلِ مقصود تو نہیں سمجھتے البتہ اُن کے نزدیک فنا لازمۂ طریق ضرور ہے۔ کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ فنا نہ تو مطلوبِ سلوک ہے اور نہ ہر سالک کے لیے لازم ہے، بلکہ یہ تو راہِ سلوک کے عوارض میں شمار ہوتی ہے۔

فنا کا مادّہ "فنی" ہے، فَنِيَ يَفْنَىٰ اور فَنىٰ يَفْنِي فَنَاءً کا معنیٰ ہے معدوم ہونا، اور کبھی کبھی اس کو اضمحلال کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کے قوٰی مضمحل ہو جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے مَاتَ شَيْخًا فَانِيًا۔ فقہا کہا کرتے ہیں لَا يُقْتَلُ فِي الْمَعْرَكَةِ شَيْخٌ فَانٍ یعنی جنگ میں بوڑھے ضعیف کو نہ قتل کیا جائے۔

لفظ "فنا" کو اصحابِ تصوّف نے جن معنوں میں استعمال کیا ہے قرآن وسنّت میں ان معنوں میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ صحابہ کرام، تابعین اور متقدمینِ اصحابِ زہد کا کلام بھی

---

[۱] صوفیائے اسلام (انگریزی) ص ۱۷

ان معنوں میں اس لفظ سے یکسر نا آشنا ہے۔ اصحابِ تصوف قرآنِ کریم کی آیت "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ"[1] سے اپنے نظریۂ فنا پر استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہاں فنا کا معنیٰ وہ نہیں جو اصحابِ تصوف مراد لیتے ہیں۔ یہاں فنا سے مراد ہلاکت اور کلیتہً معدوم ہونا ہے۔ اسی مفہوم پر قرآنِ مجید کی بعض دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں۔ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ روئے زمین پر ہر چیز ہلاک اور معدوم ہو جائے گی اور بقا صرف ذوالجلال کو ہے۔

صوفیہ کے نزدیک فنا سے مراد یہ ہے کہ بندے کے شہود سے ہر حادث چیز معدوم ہو کر اُفقِ عدم میں اس طرح غائب ہو جائے جس طرح وہ ایجاد سے پہلے تھی۔ اور صرف حق تعالیٰ باقی رہ جائے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔

سیدالطائفہ جنیدؒ بغدادی کا نظریۂ فنا

سیدالطائفہ جنید بغدادی اور دیگر اہلِ استقامت اربابِ تصوف کا نظریۂ فنا درحقیقت ارادۂ ماسوا سے فنا ہے یعنی بندے کی اپنی مراد اپنے حظوظ اور اپنے ارادے سے فنا ہو جائیں صرف مرادِ حق باقی رہ جائے۔ جنیدؒ بغدادی کے نزدیک توحید کے چار مدارج ہیں۔ توحیدِ عوام، توحیدِ علماء، توحیدِ خواص اور توحیدِ خاص الخاص۔ جنیدؒ کے نزدیک توحید کے اعلیٰ ترین درجے کا حصول فنا کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔

جنید نے فنا کو بھی تین مدارج میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا درجہ فنائے صفات ہے، یعنی بندہ اپنی صفاتِ مذمومہ کو فنا کر دے تاکہ وہ نفس کی خواہشات کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا پر عمل کر سکے۔

دوسرا درجہ فنائے لذاتِ نفسی ہے، یعنی بندہ تمام جسمانی لذات کی خواہشات کو فنا کر دے تاکہ غیر اللہ سے تعلق بالکل ختم ہو جائے۔

تیسرا درجہ فناء الفنا ہے، یعنی پھر بندے سے فنا کا شہود بھی معدوم ہو جائے۔

جنید بغدادیؒ کا نظریہ درحقیقت ارادۂ ماسوا سے فنا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل ملفوظات

[1] قرآن مجید۔ سورۃ الرحمٰن آیت ۲۶، ۲۷۔

سے اس بات کی واضح تائید ہوتی ہے۔ جنیدؒ فرماتے ہیں:۔

"تو اُس وقت تک اللہ کا بندہ نہیں بن سکتا جب تک تجھ میں غیر اللہ کی باقیات میں سے ایک بھی موجود ہے[1]"

جنیدؒ نے اس بات کی تصریح کی ہے۔ مقامِ فنا سالک کی منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ اُس کی اصل منزل مقامِ بقا ہے۔

فنا کی اقسام صوفیہ کے ہاں فنا کے تین نظریے پائے جاتے ہیں:۔

اوّل۔ ارادہ ماسوا سے فنا۔

دوم۔ شہود ماسوا سے فنا۔

سوم۔ وجود ماسوا سے فنا۔

ارادۂ ماسوا سے فنا یہ اہل حق اور اہل استقامت اصحابِ فنا کا نظریہ ہے۔ اہلِ استقامت فنا سے دو اُمور مراد لیتے ہیں۔

اوّل:۔ شہودِ ربوبیت وقیومیت میں فنا یعنی سالک اس امر کا مشاہدہ کرتا ہے کہ تمام کائنات کی تدبیر اور اس کا قیام، تخلیق و رزق رسانی، عطا کرنے اور محروم کرنے اور نفع و نقصان دینے میں رب تعالیٰ کی ذات واحد اور منفرد ہے۔ سالک اس حقیقت کے شہود میں مستغرق ہوتا ہے کہ تمام وجودِ کائنات میں انفعالیت ہے اور تمام کائنات احکامِ ربوبیت کے جاری ہونے کا محل ہے۔ سالک اپنے یا کسی اور کے نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اس مشہد کے متحقق ہونے کے بعد وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر نظر رکھتا ہے اور وہ ربوبیت و قیومیت کے شہود میں فنا ہو کر ہر ماسوا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ واجبات و نوافل کو قائم رکھتا ہے۔

دوم:۔ شہودِ الوہیت میں فنا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ سالک ہر ماسوا کے ارادہ، اس کی محبت، اس کی طرف انابت، ماسوا پر توکّل، اس سے خوف اور اس پر امیدوں کو ختم کر کے صرف اسی سے خوف اور اُسی پر اُمید میں فنا ہو جاتا ہے۔ اس فنا کی حقیقت یہ ہے کہ سالک محبت

---

[1] حلیۃ الاولیاء ۱۰ : ۲۷۵

خوف و رجاء اور تعظیم و اجلال بس اللہ تعالیٰ کی فردانیت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی حالت بقول ابویزید بسطامیؒ یہ ہو جاتی ہے۔

"أُرِيدُ أَلَّا أُرِيدَ إِلَّا مَا يُرِيدُ" (میں چاہتا ہوں کہ میں صرف وہی چاہوں جو وہ چاہتا ہے)[۱]

اور انہی معنوں میں حضرت جنید بغدادی کی ایک مشہور دعا منقول ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی فردانیت کے شہود اور ارادۂ ماسوا سے فنا کی توضیح ہوتی ہے۔ دعا کے کچھ الفاظ یہ ہیں:۔

"اے اللہ! میرے قلب سے تیرے ذکر کے سوا ہر ذکر کو، تیری محبت کے سوا ہر محبت کو، تیری مودّت کے سوا ہر مودّت، تیرے اجلال کے سوا ہر اجلال کو، تیری تعظیم کے سوا ہر تعظیم کو، تیری ذات پر امید کے سوا ہر امید کو، تجھ سے خوف کے سوا ہر خوف کو، تیری طرف رغبت کے سوا ہر رغبت کو، تیرے ڈر کے سوا ہر ڈر کو اور تجھ سے سوال کے سوا ہر سوال کو محو کر دے"[۲]

یہ فنا کا وہ مرتبہ ہے جو سالک کو توحید کے بلند ترین مدارج پر فائز کرتا ہے۔ یہاں بندۂ مومن کی مراد اللہ تعالیٰ کی مراد میں گم ہو جاتی ہے اور بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک آلے کی مانند ہو جاتا ہے اور وہ اقبالؒ کے قول ۔

"ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ"

کا مصداق بن جاتا ہے۔ اسی کی طرف مشہور حدیث "لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ ...... الخ" اشارہ کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندۂ مومن اپنے رب کی محبت اور اس کے قرب کی حلاوت محسوس کرتا ہے اور اس کے قلب سے غیر اللہ کا نشان ..... مٹ جاتا ہے۔ یہ قرب اور ایقان کی حالت ہے اور یہ علم الیقین کی حالت ہے۔

[۱] العبودیۃ ص ۸۳

[۲] حلیۃ الاولیاء ۱۰ : ۲۸۶

کمالِ عبودیت یہ ہے کہ بندے کی مراد وہی ہو جو اللہ کی مراد ہو۔ بندہ صرف اسی چیز سے محبت کرے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور جب بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تو ماسوا سے اس کا دل بالکل پاک ہو۔ آیت قرآنی اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ بقول ابن تیمیہؒ اس سے مراد وہ قلب ہے جو ہر ماسوا سے سلامت، یا غیر اللہ کی عبودیت سے سلامت یا ارادۂ ماسوا سے سلامت یا محبت ماسوا سے سلامت ہو۔ یہ تمام تعبیریں صحیح ہیں۔ اس مفہوم کو بقول ابن تیمیہؒ فنا کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ یہ اوّل تا آخر اور ظاہر و باطن اسلام ہے[1] یہ انبیاء و رسل اور اولیائے کاملین کا مقام ہے۔ یہی مقامِ احسان اور مقامِ ایقان ہے۔ اور بقول عز الدین ابن عبد السلام مقامِ احسان اور مقامِ ایقان کے تحقق کو اہلِ صفا نے فنا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے[2]۔

جنید بغدادی کے نظریہ فنا و بقا کے مطابق سالک اس درجہ پر پہنچ کر مقامِ بقا پہ فائز ہو جاتا ہے۔ اور بقول ابنِ قیم[3] جو اللہ تعالیٰ کی محبت، اُس کی اطاعت اور اس کی مراد میں فنا ہو جاتا ہے اُسے یہ فنا مقامِ بقا پہ پہنچا دیتی ہے۔ جنید بغدادی کے نزدیک مقامِ بقا فنا فی اللہ کا ثمرہ ہے۔ اور بقا باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ سالک وادیٔ فنا سے نکل کر حقیقتِ شرعیہ کی وادی میں داخل ہو۔ اور سید الطائفہ جنابِ جنید ہمیشہ اسی وادی کی طرف بلاتے رہے ہیں۔ بندہ جب ارادۂ ماسوا سے فنا ہو جاتا ہے تو اُس کے دل میں کوئی ایسی مراد باقی نہیں رہ جاتی، جو مراد قرآنی اور نبوی سے متصادم ہو، اور رب کی مراد بندے کی مراد بن جاتی ہے، بندے کے تمام اقوال و افعال عین حق کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ فنا کی گھاٹی سے حقیقتِ شرعیہ کی وادی میں داخل ہونے کو نظریہ "صحو" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظریۂ صحو جنید کے تصوّف کی بنیاد ہے۔

---

[1] العبودیۃ ص ۸۵

[2] قواعد الاحکام فی صالح الانام

[3] مدارج السالکین ۳ : ۳۶۹

شہودِ ماسوا سے فنا | بسا اوقات سالک کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی محبت، اُس کا ذکر، اور اس کی عبودیت اس قدر غالب آجاتے ہیں کہ اُسے اپنے معبود کے سوا کسی چیز کا شہود نہیں رہتا۔ اُس کے قلب سے غیر اللہ کے خیال کا گذر تک نہیں ہوتا، اس کا قلب اپنے محبوب اور اپنے مطلوب میں مشغول ہو کر ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اُسے اپنے محبوب کے سوا کسی چیز کا شعور نہیں رہتا، حتیٰ کہ وہ موجود کی وجہ سے اپنے وجود سے بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اپنے شہود میں مشغول ہو کر اُسے اپنے شہود تک کی خبر نہیں رہتی۔ اپنے مذکور کی وجہ سے اپنے ذکر سے فنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے معروف میں محو ہونے سے وجہ سے اپنی معرفت سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کے شہود میں وہی باقی رہتا ہے جو ہمیشہ سے ہے۔ بہت سے اصحابِ تصوّف اس حالت کو حالِ اصطلام، فنا اور جمع کا نام دیتے ہیں[1]۔ لیکن ماسوا کا وجود معدوم نہیں ہوتا۔ ماسوا کا وجود باقی رہتا ہے، لیکن وہ سالک کے شہود سے غائب ہو جاتا ہے۔ اُس کی مثال یہ ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ستارے نظر نہیں آتے ہیں اور وہ شہود سے غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ موجود ہوتے ہیں، معدوم نہیں ہوتے۔ اس نظریے کو صوفیہ نے وحدتِ شہود کا نام دیا ہے۔ شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ وحدتِ شہود کے قائل تھے۔ مجدّد صاحب توحیدِ شہودی کو راہِ سلوک کے ضروری اُمور میں شمار کرتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک وحدتِ شہود کے بغیر فنا متحقق نہیں ہوتی اور عین الیقین کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

وجودِ ماسوا سے فنا | بعض متصوفہ کا نظریہ یہ ہے کہ فنا درحقیقت وجودِ ماسوا سے فنا ہے، یعنی وحدتِ مطلقہ میں فنا ہونا اور ہر اعتبار سے تعدد اور کثرت کی نفی کرنا اسی کو توحیدِ وجودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا توحیدِ وجودی کا نظریہ رکھنے والوں کے نزدیک فنا لَا مَوْجُوْدَ عَلَى الْحَقِیْقَةِ اِلَّا اللّٰہ کا شہود ہے۔ ان کے نزدیک ماسوا کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں، نہ شہود میں، نہ عیان میں، اس مقام پر وہ اس شہود کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ممکن الوجود خود واجب الوجود ہے۔ یعنی تمام موجودات کا وجود عینِ وجودِ حق ہے۔ ان کے نزدیک فنا درحقیقت اس امر کا

(باقی بر صفحہ ۴۵)

---

[1] مجموع الفتاوٰی لابن تیمیہؒ ۲: ۲۷۰

بحث و نظر

ایک فراموش شدہ سُنّت

(اسلامی تصوّرِ حیا، لباس اور نماز میں سر ڈھانپنے کا مسئلہ)

پروفیسر آسی ضیائی سیالکوٹ

جنوری کے ترجمان القرآن میں جناب مولانا سید محمود حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کتبِ احادیث و فقہ سے بڑی تعداد میں حوالے دے کر ثابت کیا گیا ہے کہ حالتِ نماز میں سر برہنہ رہنا پسندیدہ فعل نہیں۔ فی الحقیقت ہمارے معاشرے میں اسلام سے محبت اور اس کے تقاضوں کو حسبِ استطاعت پورا کرنے کی خواہش کے باوصف، خاصی تعداد ایسے افراد کی ہے، جن کو بعض بہت ہی ابتدائی اور عام نوعیت کے مسائل کا بھی علم نہیں۔ اور علم ہو بھی کیونکر، جب انہیں سکھانے کا اہتمام نہ ان نوجوانوں کی کسی درس گاہ میں کیا جاتا ہے، اور نہ اُن کے والدین ہی ان کی اہمیت جان کر اُن کے ذہن نشین کراتے ہیں۔ لے دے کے ایک مسجد ایسا مقام تھا جہاں ایسے مسائل اُن کے علم میں آسکتے تھے، سو وہاں اُن کو بھیجنے یا ساتھ لے جانے کی فکر اُن کے بزرگ نہیں کرتے اور جب نوجوان اللہ کی توفیق سے کسی اور طرح کی اہمیت کو پہچان کر مسجد جانا شروع کرتے ہیں تو قدم قدم پر اُن کی ناواقفیت کا دوسروں کو احساس ہوتا ہے اور زیرِ نظر مضمون بھی غالباً اسی احساس کے تحت لکھا گیا ہے۔ لیکن یہاں میں فاضل مضمون نگار سے اختلاف کی جسارت کرتا ہوں۔

میری ناقص رائے میں برہنہ سر نماز پڑھنا —— کم از کم موجودہ دور میں —— اتنا فقہی مسئلہ نہیں جتنا تمدنی ہے۔ آج سے کم و بیش نصف صدی پیشتر تک کوئی شخص ہمارے "پاک ہندی"

معاشرے میں ننگے سر نماز پڑھنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت سر کی پوشش (پگڑی، ٹوپی وغیرہ) مرد کے لباس کا اہم اور لازمی جز تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے کسی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ سر ڈھانکے[1] بغیر لوگوں کے سامنے آ سکے۔ بلکہ شرفا کے گھرانوں میں تو اس کی یہاں تک پابندی کی جاتی تھی کہ کمسن بچے بھی اپنے بڑوں کے سامنے ننگے سر نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر کوئی شخص آرام کر رہا ہو اور کوئی اس سے ملنے آ جائے تو بستر سے اٹھتے اٹھتے اس کا ہاتھ سب سے پہلے اپنی ٹوپی یا پگڑی پر پڑتا تھا، جسے سر پر رکھے بغیر وہ سلام کرنا بھی معیوب سمجھتا تھا۔ مختصراً یہ اس دور کی "تہذیب" کا اہم تقاضا ہی سر ڈھانکنا، اور دن رات کے بیشتر حصے میں ڈھانکے رہنا تھا، اس لیے نماز بھی قدرتاً ننگے سر نہیں پڑھی جاتی تھی۔

مگر جب مغربی آداب معاشرت رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے میں نفوذ پاتے چلے گئے اور مزید یہ کہ ان پر عمل کرنے کی آزادی بھی اس طرح ملنے لگی کہ یہی مغربی تہذیب کے رہنما ہی ہماری سیاسی آزادی کے نقیب اور پیشوا بنے تو کون تھا جو ان "رہنمایانِ کرام" کی تقلید کرنے والوں کو ان کی کسی غلط روش پر ٹوکتا۔ یا قدیم تمدن سے ان کے انحراف پر احتجاجاً لب کشا ہوتا؟ پھر ملک کی آزادی کے بعد جب ہمارے عوام کے روابط غیر ملکی لوگوں سے بڑھے اور انہوں نے مصری، شامی، لبنانی اور ترک (وغیرہم) باشندوں کو نماز بھی ننگے سر ہی پڑھتے دیکھا (کہ ان ممالک میں یہ دستور ہم سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا) تو انہیں نماز بھی بغیر سر ڈھانکے پڑھنے کی شہ مل گئی۔

بہ ایں ہمہ ہمارے ملک میں آج بھی خاصی تعداد، بلکہ شاید اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کو بچپن ہی سے سر ڈھانک کر نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی تھی، اور وہ اب تک اس کی پابندی کیے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک دوسری انتہا ہے۔ آپ کو آج بھی ایسے حضرات بڑی تعداد میں دکھائی دیتے ہوں گے جو

---

[1] مولف مضمون چونکہ زباندانی میں مجھ سے دس گنا آگے ہیں، اس لیے میں ایک مسئلہ بطور سوال چھیڑ رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ یہ بحث ترجمان القرآن میں آئے۔ ڈھانپنا اور ڈھانکنا دو الگ الگ مصدر ہیں۔ دونوں کا محل استعمال بھی ایک نہیں ہو سکتا۔ میرا تصور یہ رہا ہے کہ ڈھانکنا کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں ڈھکن کی طرح کی کوئی چیز رکھی جاتی ہو۔ جسم کے کل یا کسی حصے کے لیے ڈھانپنا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ع "ڈھانپے کفن کے میرے عیوب برہنگی" (ف۔ ص)

مغربی سوٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود، نماز پڑھتے وقت کسی نہ کسی طرح سرڈھانکنے کا اہتمام کر ہی لیتے ہیں، خواہ اپنے رومال سے، خواہ مسجد میں اسی مقصد کے لیے رکھی جانے والی تنکوں کی ٹوپی سے! میں صاحب مضمون سے پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ کیا بہ صورت فقہی تقاضے کے علاوہ صحیح اسلامی تہذیب کا تقاضا بھی پورا کر دیتی ہے۔

قرآن کریم نے انسانی لباس کو "زینت" کا نام دیا ہے (خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ ۷: ۳۱) دوسرے مقام پر اسے "ریش" (۷: ۲۶) کی صفت سے متصف قرار دیا گیا ہے اور اس میں بھی زینت کا مفہوم شامل ہے۔ گویا مقصودِ شارع یہ ہے کہ انسان نہ صرف عام زندگی میں ایسا لباس پہنے جو معقول اور خوش منظر ہو بلکہ نماز میں بھی اس کا اہتمام کرے۔ چنانچہ ابتدائی اسلامی معاشرے سے لے کر تقریباً موجودہ دور تک امتِ مسلمہ کے افراد کا لباس، باستثناء معدودے چند سر پھروں کے، ہمیشہ معقول و شائستہ اور اسلامی تہذیب کے مطابق رہا ہے، اور اس میں سر کی پوشش کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ "پگڑی" یا "ٹوپی" کے الفاظ استعارتاً عزت و آبرو کے معنی دینے آتے ہیں۔ "پگڑی اچھالنا" اور "ٹوپی اتار لینا" ایسے محاورے بن گئے جن کے معنی ذلیل کرنا ہیں۔ ظاہر ہے ایسے اسلامی معاشرے میں جب علمِ فقہ مدوّن ہوا تو اس میں لباس کے اجزا میں سر کی پوشش کو لازماً نماز کے آداب میں شمار کیا گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ بعد کے ادوار میں، جب مظاہرِ دین کو عینِ دین اور روحِ دین سمجھ لیا گیا، اور تقلیدِ جامد نے ازعامی تا عالم، اشعار پایا تو متاخرین علماء نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ عبادات کی اصل وہ جذبہ ہے جس کے تحت انسان اپنے رب کی عبادت کرتا ہے، نہ کہ وہ ظواہر جن کو طوعاً و کرہاً، خواہ لوگوں کی شرماشرمی، خواہ عادتِ مستمرہ کے طور پر، لوگ اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا اب اُن کا زور تمام تر انہی ظواہر کی درستی پر صرف ہونے لگا۔ نماز اور اس کے لوازم کی جزئیات پر تاکید اسی تقلید اور جذبۂ عبودیت سے بے اعتنائی کا نتیجہ تھا۔ نماز میں سرڈھانکنا بھی میرے خیال میں انہی مسائل میں سے ہے۔ میں صاحبِ مضمون سے یہ حسنِ ظن رکھتے ہوئے بھی کہ وہ ظواہر پر زور دینے والے علماء میں سے نہیں ہیں، بہ ادب گذارش کروں گا کہ فقہی اعتبار سے چاہے نماز میں سرڈھانکنا ضروری ہو، اس پر جو لوگ عملدرآمد کرتے ہیں، اُن میں خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے عمل سے اسے منشائے شارع کے خلاف، بلکہ بعض صورتوں میں انتہائی مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔

یقیناً آپ نے بھی یہ منظر بارہا دیکھا ہو گا کہ بڑے معقول، مہذب اور خوش پوش صاحبان نماز پڑھتے وقت جیب سے بالشت ڈیڑھ بالشت کا رومال نکال کر اور اس کے کونوں پر گرہیں لگا کر سر پر اٹکا لیتے ہیں، یا مسجد میں پڑی ہوئی تنکوں کی میلی، پھٹی سی ٹوپی اٹھا کر اوڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر بڑے اطمینان سے نماز ادا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ میں نے تو یہ تماشا تک دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا ہاف کوٹ اتار کر سر پر جمالیا اور اس طرح آدھا چہرہ چھپائے، لٹکتی آستینوں سے نماز پڑھی (میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قمیص یا کرتے کا پچھلا دامن الٹ کر سر پر ڈال لیا اور پیٹھ ننگی رہی۔ ن ۔ ص) میں پوچھتا ہوں، کیا یہ مناظر ایک مسلمان کی نماز کو اغیار کی نظر میں (بلکہ خود شارع کی نظر میں ۔ ن ۔ ص) باوقعت بنا سکتے ہیں؟ یا اس طرح قرآن کے ارشاد کا (کہ مسجد جاتے وقت اپنی زینت پورے طور سے اختیار کرو) منشا پورا کرتے ہیں؟ مگر ان نماز پڑھنے والوں کو تو فقط اتنا ہی معلوم تھا کہ فقہ کی رو سے نماز پڑھتے وقت سر چھپانا بہرحال ضروری ہے، انہیں یہ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ محض سر ڈھانک لینا ہی مطلوبِ شارع نہیں۔ پوشش سر کا "زینت" ہونا بھی ضروری ہے۔

پس اگر آج کے دور میں جب کہ پورے معاشرے کے تمدنی لوازم میں سے سر کی پوشش تقریباً خارج از لباس ہو چکی ہے۔ اور ایک مجلس میں، خواہ وہ عوام کی ہو یا خواص کی، آپ کو ایک فیصد افراد بھی ٹوپی یا پگڑی وغیرہ سر پر رکھے نہیں ملتے، تو آپ کس طرح ان صاحبوں کو نماز کی اس فقہی صورت کو اختیار کرنے کے لیے کہہ سکتے ہیں جو صدیوں پہلے کے دور میں درست بلکہ ضروری تھی، کیونکہ تب پوشش سر بھی لباس کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جب کہ آج کی نسل سر کی پوشش کے تصور سے بھی غالباً عاری ہے۔ آج ایک شخص اچھے سے اچھا لباس پہن کر ننگے سر ہی رہتا ہے، بلکہ معززین سے بھی اسی طرح ملتا ہے اور غیر ممالک کا دورہ بھی کر لیتا ہے اور کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتا۔ تو کیا حرج ہے اگر وہ اسی طرح ننگے سر مالکِ حقیقی کے حضور میں بھی حاضر ہو جاتا ہے۔

ذرا تصور میں یہ شکل لائیے کہ ایک شخص اس حال میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ننگے سر ہے، مگر اس کے علاوہ اس کا لباس پوری طرح معقول اور مہذبانہ ہے اور اس کے برخلاف، دوسرا شخص اس حال میں محوِ نماز ہے کہ اس کے آدھے سر پر گرہیں لگا رومال چپکا ہوا ہے، یا تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی ہے جو نہ صرف جگہ جگہ سے تار تار ہے بلکہ ہر آئندہ و روند کے استعمال سے میلی ہوتے ہوتے کالی ہو رہی ہے اور وہ اس طرح

سر پہ ٹکی ہوتی ہے کہ چُنڈیا کے سوا باقی پورا سر مع اُلجھے اور بڑھے ہوئے بالوں کے نظر آ رہا ہے۔ یہ تشبیہ فرضی نہیں، روزمرہ کے مشاہدے کی بات ہے۔ میں پوچھتا ہوں، ان میں سے کون ہے جو شارع کا منشا بہتر طور پر پورا کرتا ہے؟

میں مفتی یا فقیہ نہیں، مگر دین کی جو معمولی سی سوجھ بوجھ اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے اس کی بنا پر اپنے حلقۂ متعارف میں میں کہا کرتا ہوں کہ جس ہیئت کذائی میں آپ لوگ ایک عام سے افسر کے سامنے جاتے ہوئے شرمائیں، اُسی حلیے میں مالکِ کون و مکان، رب العلمین کے دربار میں حاضری دینا آپ کس طرح گوارا کر لیتے ہیں؟ گویا صرف سر کو چھپا لینا نہیں، معقول لباس میں ہونا اصل مقصود ہے۔

اور اب میں واپس اپنے اُس قول کی طرف آتا ہوں جس سے میں نے ان سطور کا آغاز کیا تھا یعنی میرے خیال میں سر کی پوشش فقہی سے زیادہ تمدنی مسئلہ ہے، لیکن یہاں ایک وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ میں خود کبھی ننگے سر نماز نہیں پڑھتا (اگرچہ میں نے ایک ایک مرحوم عزیز بزرگ کو جو علمِ دین اور تقویٰ سے بہرہ وافر رکھتے تھے، بارہا اس حال میں دیکھا کہ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اپنی بھاری بھرکم اور معقول ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دیتے تھے۔) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹوپی میرے عام لباس کا جز ہے۔ مگر نئی نسل سے میں عام طور پہ یہی کہا کرتا ہوں کہ سر ڈھانکنے کی مضحکہ خیز کوشش کے بجائے سر کے بال ٹھیک سے آراستہ کر کے ننگے سر نماز پڑھ لینا میری رائے میں زیادہ بہتر ہے۔ البتہ ہماری، خصوصاً علمائے کرام کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس تمدن کی خرابیاں واضح کر کے نئی نسل کو اسے ترک کرنے کا مشورہ دیں، جس کی بنیاد ہی بے حیائی پہ رکھی گئی ہے جب کہ اسلامی تمدن میں حیا "شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ"

اس حیا سے عاری تمدن کا شاخسانہ یہ ہے کہ سر ڈھانکنا تو ایک طرف، ہمارے نوجوان کو ستر ڈھانکنا بھی نہیں معلوم۔ فاضل مضمون نگار کو اس بات پر تشویش ہے (اور بجا بھی ہے) کہ لوگ ننگے سر نماز ادا کرنے لگے ہیں، حالانکہ فقہی اعتبار سے ایسی نماز کو زیادہ سے زیادہ مکروہ کہا جا سکتا ہے، لیکن مجھے اس سے بڑھ کر اس بات پہ تشویش ہے (اور اس تشویش میں میں صاحبِ مضمون کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں) کہ لوگ ننگے بدن نماز پڑھنے لگے ہیں، جو فقہی اعتبار سے فاسد ہی ہوتی ہے! میری اس بات پہ ناظرین چونک اُٹھے ہوں گے۔ لیکن یہ چونک اُٹھنا بھی

میرے دعوے کی تائید کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی حیا کی اقدار سے کس قدر غافل یا بے خبر ہو گیا ہے۔ مغربی تمدن سے متاثر ہو کر آج ہمارے کثیر بھائی، کیا شرفا اور کیا عوام، جس طرح بے تحاشا مغربی لباس اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں وہ میرے نقطۂ نظر سے حد درجہ خوفناک ہے۔ جب میں اچھے خاصے متقی اور مہذب شرفاء، بلکہ تحریک اسلامی سے وابستہ حضرات کو بھی کوٹ پتلون (یا اکثر اوقات صرف پتلون) میں ملبوس اور گلے میں مسیحیت کا شعار، ٹائی باندھے دیکھتا ہوں تو حیرت سے سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ لوگ کس طرح سترِ عورات کے تقاضوں تک سے نابلد یا غافل ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ پتلون کی چُستی اور تنگ دامانی میں اسلامی حیا کسی طرح نہیں سما سکتی؟ خصوصاً جب ایک نمازی اسی پتلون میں رکوع و سجود کرتا ہے تو وہ صریحاً ارشادِ نبوی کے بموجب "کاسیٔ عاری" نظر آتا ہے، اور اُس کا وہ حصۂ جسم، جو شریعت کی رُو سے ستر بلکہ سترِ غلیظ ہے، نمایاں ہو جاتا ہے[1]۔ جیسا کہ ایک مرتبہ مشہور عالم اور صحافی مولانا عامر عثمانی مرحوم نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ لباس کا یہ مطلب نہیں کہ جسم پر کپڑا منڈھ لیا جائے۔ اسلامی ثقافت کی رُو سے ایسا لباس کسی طرح لباس کے حکم میں نہیں آسکتا۔ پس ضرورت اس کی ہے کہ ٹوپی یا عمامہ سر پر رکھوانے کی فکر کرنے سے پہلے اس مہم کا آغاز کیا جائے کہ مسلمان جدید حیا سوز مغربی تمدن کو چھوڑ کر اپنے ملی تمدن کی اقدار اپنائیں۔ ہمارا سلوگن مختصر الفاظ میں یہ ہونا چاہیے: "حیا بڑھاؤ، ہوٰا (ہوائے نفس) گھٹاؤ"۔ ہمارے پورے معاشرے کا بگاڑ، میرے نزدیک، اِنہی دو بیماریوں کا نتیجہ ہے کہ حیا، جو ایک مومن کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے، ہر شعبۂ زندگی سے خارج ہو چکی ہے، اور ہوائے نفس جس پر قابو پا کر ہمیں اللہ کے احکام کا مُسلم بن کر رہنا چاہیے تھا، اِس حد تک بڑھ گئی ہے کہ غالباً ملحد قومیں بھی اس راہ میں ہم سے پیچھے رہ گئی ہیں۔

موجودہ حکومت کے دَور میں دین کے لیے کام کرنا اور دینی شعائر کی پابندی کرنے پر لوگوں کو دعوت دینا اتنا دشوار نہیں رہا جتنا سابق ادوار میں تھا۔ خود حکومت بھی کم از کم دعوٰی یہی کرتی ہے کہ اُس کا نصب العین اسلامی نظام نافذ کرنا ہے۔ اس ضمن میں ایک پیش رفت، خواہ وہ بظاہر معمولی

[1] اور جدید تراش کی پتلون میں تو رکوع و سجود کے بغیر بھی انسان صاف ننگا کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اسی فیشن کا رواج ہمارے نوجوانوں میں آج زیادہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ (مؤلف)

ہی ہو۔ میرے نزدیک اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ وہ [illegible] دوسرے داعیانِ حق کو بنی بات کہنے کا موقع فراہم کرتی ہے، اور وہ ہے قومی لباس کا افسران حکومت کے لیے لازم قرار دینا۔ اس نتیجے میں اب حکام اور افسران بلکہ گورنروں اور وزیروں تک کو مغربی لباس چھوڑ کر قومی لباس اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ ایسے میں ہمارے رفیقوں اور دین کی طرف بلانے والوں کو پورے زور سے اس کی فکری تائید کرنی چاہیے، یعنی انہیں واضح کرتے رہنا چاہیے کہ کوٹ پتلون ہمارے اسلامی تصوّرِ حیا کے قطعاً منافی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے پائنچے بھی خلافِ شرع لمبائی تک لٹکتے ہیں، جو ایک الگ گناہ ہے[1]۔ اور شیروانی اور شلوار یا پائجامہ ہمارے ہاں یونہی الل ٹپ رواج نہیں پا گیا تھا۔ بلکہ ہمارے قریبی اسلاف نے ہماری تمام دینی اور ماحولی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس لباس کو بطور "فیشن" اختیار کیا تھا۔ کیونکہ یہ سَوْءَۃ کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے، خوش منظر بھی ہے اور ہمارے موسموں کے لیے بھی موزوں ہے۔ اس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک طرف حکومت کا حکم اور دوسری طرف علماء کی اخلاقی اور اسلامی توجیہہ ہمارے قومی لباس کے پھر رائج ہونے میں ممد ہو گی۔ اور اس کے نتیجے میں ہم اسلامی حیا کے جس تصوّر سے عاری ہوتے جا رہے تھے وہ از سرِ نو ہمارے ذہنوں اور دلوں میں راسخ ہوتا چلا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

نوٹ:۔ اب صرف ایک اختتامی مضمون اس موضوع پر مولانا سید محمود حسن صاحب (آوّلین مضمون نگار) کا شائع ہو گا۔ اس کے بعد یہ بحث بند کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

---

[1] بعض حضرات نماز پڑھتے وقت پتلون کے پائنچے چڑھا کر ٹخنے ننگے کر لیتے ہیں، لیکن اس طرح وہ نادانستہ مزید دو گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں: ایک لباس کا حلیہ بگاڑنا، دوسرے یہ نیّت کرنا کہ نماز کے بعد پائنچے پھر نیچے کر لیں گے، حالانکہ ایک گناہ کو نماز کے وقت تک ملتوی کر دینا اور نماز کے بعد پھر اسی گناہ پر اصرار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی میخوار کا رمضان تک کے لیے تائب ہو جانا اور عید کا چاند دیکھتے ہی "کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود، پیدا شد" کہتے ہوئے غرق مے ناب ہو جانا۔

رسائل و مسائل

(گذشتہ سے پیوستہ)

مدعی کے غور و فکر کے لیے تین سوال پچھلے شمارے میں ہم نے ان تمام روایات کا خلاصہ جمع کر دیا ہے، جو امتناعِ مزارعت کے مدعی کے حق میں ہیں۔ اگر ان روایات کے مقابلے پر کوئی اشکال نہ ہوتا تو یہ بڑا مضبوط ثبوت ہو سکتی تھیں۔ جرح کے لیے ہم تین ابتدائی نکات سامنے رکھتے ہیں:۔

۱ــــ یہ معلوم عام حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض مفتی و معلم ہی نہ تھے، ملک کے حاکم اور نظم ونسق کے کارپرداز بھی تھے اور یہ بھی واضح ہے کہ زمین کا معاملہ دو چار یا دس پانچ افراد کی نجی اور شخصی زندگی کا کوئی محدود اتفاقی و ہنگامی معاملہ نہ تھا کہ جماعتِ عام سے الگ اُن کو چپکے سے بتا دیا جاتا بلکہ یہ تو پوری سلطنت کے نظم سے متعلق تھا اور لاکھوں افراد کی معیشت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ لہٰذا اسے بخوبی شائع و ذائع ہونا چاہیئے تھا۔

۲ــــ یہ بات حالتِ ایمان میں سوچی بھی نہیں جا سکتی کہ حضورؐ نے زبان سے تو ایک چیز کو غلط ارشاد فرمایا ہو اور عملاً اسے رائج رہنے دیا ہو، یا زبان سے ایک دوسرے طریقے کو برحق فرمایا ہو اور عملاً اُسے جاری و نافذ نہ کریں۔

۳ــــ یہ بھی ناممکن بات ہے کہ حضورؐ ایک طریقے کو روکنا اور دوسرے کو رائج کرنا چاہتے ہوں، مگر صحابہ اُن کو نہ کریں۔ یا یہ کہ خلفائے راشدین کو یہ معلوم ہو چکا ہو کہ حضورؐ کسی رواج کا انسداد کر کے ایک دوسرا اصلاحی طریقہ جاری کرنا چاہتے تھے، مگر تمام زمانۂ خلافتِ راشدہ میں حضورؐ کے منشا کے خلاف کسی صورت کو وہ رائج رکھیں۔

اب ان تینوں نکات کو سامنے رکھ کر جناب مدعی اس حقیقت پر نگاہ ڈالیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے اپنے دور سے لے کر امیر معاویہ کے دور کے وسط تک، یعنی مسلسل ۵۰ برس مزارعت پر عمل جاری رہا۔ خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اکابر صحابہ اور آپ سے قریب ترین تعلق رکھنے والے تمام بڑے بڑے گھرانے بٹائی پر زمینیں دیتے رہے ـــ اور اتنی بڑی جماعت کے عوام اور اہل علم اور ارباب حل وعقد میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ آنحضرتؐ نے بٹائی اور لگان پر زمین کاشت کے لیے دینے کو منع فرمایا ہے۔ بس صرف متذکرہ پانچ چھ افراد ہی کو اس ممانعت کا علم تھا۔ فی الحقیقت یہ ایک حیرت انگیز صورت حالات ہے۔

رافع بن خدیج کی روایت کا انکشاف پہلی بار ۵۰ھ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے ہوا، یعنی نصف صدی گذر گئی۔

نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر اپنی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) کے زمانوں میں برابر کرائے پر دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب امیر معاویہؓ کی حکومت کا آخری زمانہ آیا (یعنی تقریباً ۵۰ھ یا اس کے کچھ بعد) تو اُن کو یہ خبر پہنچی کہ رافع بن خدیج نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فعل کی ممانعت کا حکم روایت کرتے ہیں۔ یہ سُن کر وہ جناب رافع سے ملنے گئے۔ اور میں (یعنی نافع) ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے رافع سے پوچھا کہ یہ کیا روایت ہے جو تم بیان کرتے ہو؟ اس پر جناب رافع نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمینوں کے کرائے سے منع فرماتے تھے۔ اس پر ابن عمر نے اپنی زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں۔ اُن سے جب اس بارے میں پوچھا جاتا تو بس وہ یہی کہتے کہ رافع کا دعوے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے حضرت سالم کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ (سالم کے والد) کے سوال پر حضرت رافع نے اپنے دو چچاؤں کے حوالے سے بیان کیا کہ حضورؐ نے زمین کے کرائے سے منع فرمایا۔ اس پر حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ "مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمینیں کرایہ پر دی جاتی تھیں۔"

خیال رہے کہ عبداللہ بن عمر وہ شخص ہیں جن کی حقیقی بہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں، جن کے والد حضرت عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے معتمد ترین وزیر و مشیر

رہے اور پھر خود دس سال تک اسلامی حکومت کے خلیفہ رہے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُن کے پورے زمانۂ نبوت اور پورے زمانۂ خلافتِ راشدہ میں یہ خبر نہ ہوئی کہ زمینوں کے بارے میں اسلام کا قانون کیا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کا اپنا بیٹا اُن کی طرف سے ان کے گھر کی زمینداری کا انتظام ایسے طریقے پر کرتا رہتا جو اسلامی قانون میں ممنوع تھا؟

مدعی یہ سوال کر سکتا ہے کہ پھر عبداللہ بن عمر نے رافع کی روایت کو قبول کیوں کر لیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے مزاج میں احتیاط و ورع کی حد سے گذر کر تشدد تک پہنچ گئی تھی۔ آخر عمر میں تو شدت اتنی بڑھی کہ وضو میں اتنا مبالغہ کرتے کہ آنکھوں کے اندرونی حصوں کو بھی دھویا کرتے۔ اپنے بچوں کو اگر پیار کر لیتے تو پھر کلی کئے بغیر نماز نہ پڑھتے۔ نماز کی جماعت میں اگر بعد میں آ کر شریک ہوتے تو چھوٹی ہوئی رکعتیں ہی نہ پڑھتے، سجدۂ سہو بھی کرتے۔ اس شدتِ احتیاط کی بنا پر انہوں نے رافع بن خدیج کی روایت کو اختیار کر لیا۔

یہ تو روایت پر بحث تھی، ابھی ہمارے پاس حضورؐ اور حضورؐ کے کثیر صحابہ کی عملی سنّت قابلِ بیان ہے۔

خیبر کی زمینوں کا معاملہ فتح خیبر کے وقت وہاں کی زمینوں پر یہودیوں کی ملکیت ختم کر دی گئی، اور پھر یہودیوں ہی کی درخواست پر اُن سے بٹائی کا معاملہ آدھی پیداوار پر کیا گیا۔ واضح رہے کہ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی۔ اور بقیہ نصف زمینوں کے مالک وہ پندرہ سو حصہ دار تھے جن پر اٹھارہ سو قطعات تقسیم کر دیئے گئے۔ بٹائی کی جو نصف پیداوار وہاں سے آتی وہ حکومت اور انفرادی حصہ داروں کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی جاتی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ اور آپ ہر سال حصے میں ملنے والے حصہ پیداوار — کھجوروں اور غلے — کو اپنی ازواج مطہرات میں برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی طریقے کو حضرت ابوبکرؓ نے جاری رکھا۔ اور اسی پر حضرت عمرؓ نے اس وقت تک عمل کیا جب معاہدے کے تحت یہود کو شرارتوں کی وجہ سے خیبر سے نکال دیا گیا۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ اراضی خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز رکھی

کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ زمین لے لیں۔ اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں۔ اور اس کا غلہ اور ثمرہ لیتی رہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے زمین لے لی اور دیگر ازواجِ مطہرات نے غلہ اور ثمرہ لینا پسند کیا۔

ذرا خیال کریں، یہ کتنا بڑا واقعہ ہے، کتنے افراد کا اس سے تعلق تھا، کتنے لمبے عرصے تک یہ جاری رہا۔ آنحضورؐ نے خود اسے شروع کیا اور دو خلفائے راشدین نے اسے جاری رکھا۔ یہ رسولؐ اور اجلِ صحابہ کی عملی سنّت نہایت درجہ مشہور اور معلومِ عام تھی۔ اس کے مقابلے میں کوئی قولی روایت جو سند کے لحاظ سے کیسی بھی دقیع ہو، قانونِ شریعت نہیں بن سکتی۔ وہ اگر تھی بھی تو عملی سنّت نے اسے منسوخ کر دیا۔

جو لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا تھا نہیں خراج کا تھا، وہ ذرا غور کریں کہ حکومت کی ملکیتی زمین کا تو خراج ہو سکتا ہے مگر بقیہ آدھی زمین جو افراد کی ملکیت میں دی گئی تھی، اس کی بٹائی کو خراج کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کے یہودی باقاعدہ ذمی رعایا نہ تھے، کیونکہ اُن پر جزیہ نہیں لگایا گیا، اس لیے مسلمان مجاز تھے کہ اُن سے جو چاہتے لیتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے وقت نازل ہی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھلا جزیہ کے عاید کرنے نہ کرنے کا کیا سوال؟ؔ اہلِ خیبر کا ذمی ہونا اس سے ثابت ہے کہ اسلامی حکومت نے انہیں ایک باضابطہ معاہدے اور قرارداد کے مطابق اپنے ملک میں آباد رہنے دیا۔ اُن پر خراج عاید کیا اور اُن پر دیوانی و فوجداری قوانین نافذ کیے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہودی ذمی نہ تھے لہٰذا مسلمان اُن سے جو چاہتے لیتے، حالانکہ یہودیوں کی بستیوں اور محلوں میں مسلمان جب چلنے پھرنے لگے اور اُنھوں نے کچھ دست درازیاں کیں تو شکایت ملنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور کہا کہ "اللہ نے تمہارے لیے یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہلِ کتاب کے

ؔ پھر یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ بعد میں جب جزیہ کے احکام نازل ہو گئے تو اُن پر جزیہ کیوں نہ لگایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے سے جب کسی گروہ کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہو تو اس میں یک طرفہ طور پر کسی نئی شرط کا شامل کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

گھروں میں بلا اجازت گھسو، اُن کے بال بچوں کو مارو پیٹو اور اُن کے پھل کھا جاؤ، حالانکہ جو کچھ اُن پر واجب تھا وہ اُنہوں نے ادا کر دیا۔ یہ خطبہ یہودیوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذمی نہ تھے۔

انصار اور مہاجرین کے درمیان بٹائی کا معاملہ اب ایک اور بڑے معاملے کو لیجیے۔ انصار نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ ہمارے نخلستانوں کو ہمارے اور مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔ آنحضرتؐ نے انکار کر دیا۔ پھر انصار نے مہاجرین سے کہا کہ:

"آپ لوگ ہماری طرف سے ان نخلستانوں میں کام کریں اور ہم آپ کو ثمرہ میں شریک کریں گے۔"

مہاجرین نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

واضح رہے کہ اس کے راوی وہی ابوہریرہؓ ہیں جو لگان اور بٹائی کی ممانعت اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین دینے کی ایک روایت کے راوی ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ معاملہ حضورؐ کے نوٹس میں لا کر طے کیا گیا۔

اکابر صحابہ کا عمل قیس بن مسلم نے حضرت ابوجعفر (یعنی امام محمد باقر) سے یہ روایت کی کہ

"مدینے کے مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔"

امام بخاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد مزید تائیدی نظائر پیش کرتے ہیں:۔

"بٹائی پر معاملہ حضرت علی نے کیا ہے، سعد بن مالک اور عبداللہ بن مسعود نے کیا ہے، عمر بن عبدالعزیز اور قاسم اور عروہ نے کیا ہے۔ آلِ ابوبکرؓ، آلِ علیؓ آلِ عمرؓ سب بٹائی پر کاشت کراتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس طرح معاملہ کیا کرتے تھے کہ "اگر عمر اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیداوار لے گا اور اگر کاشت کار اپنا بیج لائیں تو اُن کا حصہ اتنا ہوگا۔"

حضرت ابوجعفر (امام محمد باقر) کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ "نصف نصف کی بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

طاؤس کی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل بھی اپنی زمین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے رہے ہیں۔[1] حضرت معاذ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی اور عامل زکوٰۃ مقرر کیا تھا۔ اور ان کے بارے میں فرمایا کہ "حلال و حرام کا علم سب سے زیادہ رکھتے ہیں"۔ پھر انہیں حضرت عمرؓ نے پورے شام کا فوجی گورنر مقرر کیا تھا۔ کیا ایسے شخص کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اسلام کا قانونِ اراضی کیا ہے؟

موسیٰ بن طلحہ کی روایت ہے کہ حضرت عثمان نے عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، خباب بن ارت اور سعد بن مالک کو زمینیں عطا کی تھیں۔ ان میں سے عبداللہ بن مسعود اور سعد بن مالک اپنی زمینیں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر کاشت کے لیے دیتے تھے۔

ان ساری روایات سے نہایت ممتاز صحابیوں کا عمل سامنے آتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کے سامنے ۵۰ سال تک کبھی بٹائی کے امتناع کا حکم نہیں آیا۔ آیا ہوتا تو وہ اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کرسکتے۔

تنقید بہ لحاظ روایت اب ہم مدعی کے سامنے ایک دوسرا اصول رکھتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین ایک دوسرے کے متضاد و متناقض نہیں ہو سکتے بلکہ لازم ہے کہ وہ سب کے سب ایک فریم میں اس طرح نصب ہو جائیں کہ کوئی تصادم ان میں نہ ہو۔ اس اصول کی روشنی میں امتناعِ مزارعت کی روایت اسلام کے بعض واضح قوانین سے متصادم ہوتی ہیں۔ اب یا تو ان سارے قوانین کو اس روایت کی خاطر بدل دیا جائے، یا ان قوانین کی کسوٹی پر اس روایت کی جانچ کی جائے۔ قابلِ توجہ قوانین یہ ہیں:۔

---

[1] اس روایت میں کمزوری صرف اتنی ہے کہ راوی نے حضرت عثمانؓ کا دور بھی لے لیا، حالانکہ معاذ بن جبل کی وفات دورِ فاروقی میں ہوئی۔

۱۔ اسلامی نظام میں ملکیتِ زمین کے حقوق صرف تندرست بٹے کٹے مردوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں تک بھی یہ حقوق پہنچتے ہیں۔ اگر مزارعت ممنوع ہو تو پھر اِن سب کے لیے ملکیتِ زمین بے معنی ہو جاتی ہے۔

۲۔ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے جس طرح ایک آدمی کی میراث اس کے مرنے پر بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، اسی طرح بسا اوقات بہت سارے متوفیان کی طرف سے میراث ایک آدمی کے پاس بھی آجاتی ہے۔ اب اگر اسلام کا قانونِ وراثت ایک شخص کو خود کاشتی رقبے سے زائد کا مالک بناتا ہو، اور دوسری طرف اس کا قانونِ امتناع مزارعت (اگر وہ ثابت ہو) اُسے خود کاشتی رقبے سے زائد کو چھوڑنے پر مجبور کر دے تو یہ دو متناقض قانون ہوئے۔

۳۔ اسلامی قانونِ تجارت نے بیع و شریٰ پر یہ پابندی نہیں لگائی کہ کوئی شخص کسی بھی نوعیت کی جائز اشیا کو زیادہ سے زیادہ ایک حد تک ہی خرید کر اپنی ملکیت میں لے سکتا ہو۔ اب اگر دیوانی قانون کے تحت ایک شخص حسبِ دلخواہ زمین خریدتا ہے اور دوسری طرف قانون امتناعِ مزارعت موجود ہو تو گویا زمین کے معاملے میں آزادئ بیع و شریٰ کالعدم ہو جائے گی۔

۴۔ اسلام میں تحدیدِ ملکیت کا قانون اصولاً موجود نہیں[1]۔ لیکن اوپر بیان کردہ روایات مزارعت زمین کے معاملے میں تحدیدِ ملکیت کر دیتی ہیں۔

۵۔ اسلام احسان اور فیاضی کی تعلیم ہر دائرے اور معاملے میں دیتا ہے۔ لیکن اپنے واجبی حقوق وصول کر لینے کے بعد وہ فیاضی کو اُصولاً آدمی پر بذریعہ قانون فرض قرار نہیں دیتا۔ زائد از ضرورت چیزیں دوسروں کو دے دینا، حاجت مند کو قرض دینا، اپنا خالی مکان یا مکان کا کوئی حصّہ

---

[1] بعض پیچیدہ حالات میں خاص طور پر ان معاشروں میں جو عرصۂ دراز سے اسلامی نظام سے محروم رہنے کی وجہ سے معاشی فساد کا شکار ہو گئے ہوں، کسی قسم کے مال یا جایداد یا اسباب کے متعلق ایک عبوری دورِ اصلاح و تعمیر میں بعض تحدیدات اختیار کی جاسکتی ہیں، یا کثیر التعداد عوام کی پریشان حالی یا زرِ مبادلہ یا تجارتِ خارجہ کے نہایت اہم تقاضوں کے تحت خاص اقدامات کیے جاسکتے ہیں، مگر کوئی مستقل قانون ایسا نہیں تسلیم کیا جاسکتا جو قانونِ شریعت کے فریم ورک کو بدل دے۔ (لنسے رضی)

کسی دوسرے کو اُخروی مفاد کے لیے مفت دے دینا، یا کم سے کم کچھ وقت بلا کرایہ استعمال کا موقع دینا، زائد سواریوں، کپڑوں اور برتنوں کو دوسروں میں تقسیم کر دینا، پیمانے اور اوزار وغیرہ کو دوسروں کو عاریۃً مہیا کرنا ان سب صورتوں کے لیے ترغیب موجود ہے، مگر قانوناً کسی معاملے میں ایسی فیاضی کو لازم نہیں ٹھہرایا گیا، مثلاً سواری کا جانور (یا بزمانۂ حاضر موٹر گاڑی و سکوٹر) ایک سے زائد ہو تو دوسرے بھائی کو بلا معاوضہ دے دیا جائے، یا روپیہ صرف قرض حسنہ کے طور پر ہی دیا جائے، مضاربت و مشارکت میں نہ لگایا جائے، یا خالی مکان مفت ہی پیش کیا جائے۔ اور کوئی کرایہ کبھی نہ لیا جائے، یا اسی طرح زمین اگر خود کاشت سے زائد ہو تو بلا معاوضہ دوسروں میں تقسیم کر دی جائے۔ ایسے احکام کسی دائرے میں نہیں ملتے۔ خاص زمین ہی کے دائرے میں فیاضی کا قانوناً لازم ہونا پورے قانونی نظام شریعت میں کیسے کھپ سکتا ہے۔

۸۔ قانونِ تجارت یا قانونِ کاروبار کے رو سے تمام دائرہ ہائے معاش میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی گئی ہے کہ نفع و نقصان کی شراکت کے ساتھ دوسروں سے معاملہ کرے۔ اپنا روپیہ یا سرمایہ مضاربت یا مشارکت کے لیے دے سکتا ہے اور نفع کا کوئی حصہ (یا کسر) مقرر کر سکتا ہے۔ کوئی مشین یا انجن یا موٹر یا کشتی یا جہاز خرید کر کسی کام کرنے والے کو دے سکتا ہے کہ اس کے ذریعے تم کماؤ اور ایک مقررہ حصہ مجھے بھی دیتے رہو۔ یہی اصول صرف ایک زمین کے معاملے میں کیوں ٹوٹ جاتا ہے۔

ان اشارات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے قوانینِ شریعت کے ڈھانچے میں وہ روایات فٹ نہیں بیٹھتیں۔ جن سے مدعی یہ حکم نکال کر سامنے لایا ہے کہ اسلام میں مزارعت جائز نہیں۔ اس حکم کو ماننے سے لازم آتا ہے کہ بہت سے قوانین میں رد و بدل کیا جائے۔ یا اگر ان سارے قوانین کو اپنی جگہ محکم رکھنا ہو تو اس حکم کو شریعت کے قانونی ڈھانچے اس نقطۂ نظر سے تصور نہ کیا جائے۔ اس حکم کی بنیاد جن روایات پر ہے ان میں کوئی جھول ہے۔

امتناعی احکام کا اصل مفہوم | روایت اور درایت کے جملہ نکات کے لحاظ سے [illegible] کے جواب اب ہم مدعی کے سامنے یہ حقیقت لانا چاہتے ہیں کہ امتناعی احکام کا تعلق اصل میں کس صورت معاملہ سے تھا، جو رافع بن خدیج اور دوسرے ہم خیال راویان [illegible]

ہو سکی۔ روایتیں نہ جھوٹی ہیں، نہ ضعیف، کمی یہ ہے کہ ان میں پوری بات بیان نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ غلط فہمیاں پھیلیں۔

سنہ ھ کے لگ بھگ زمانے میں جب یکایک اُن روایات کی خبر پھیلی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے تو ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ تب لوگ روایات کی کھوج کرید کے لیے دوڑے اور روایت کرنے والوں سے ملے۔ اِس طرح جو بات کھلی وہ ذیل کی روایات سے واضح ہے:۔

۱۔ حنظلہ بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج سے پوچھا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنا کیسا ہے؟ انہوں نے کہا: کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مزید تشریح یوں کی:۔

"اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ اپنی زمینیں اُجرت پر دیتے ہوئے یہ طے کیا کرتے تھے کہ پانی کی نالیوں کے سرے پر اور اُن کے کناروں پر اور کھیت کے بعض مخصوص حصوں میں جو پیداوار ہوگی وہ مالک زمین لے گا۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک جگہ کی کھیتی برباد ہوتی اور دوسری جگہ کی بچ جاتی، اور کبھی اِس جگہ کی بچ جاتی اور اُس جگہ کی برباد ہو جاتی۔ اُس زمانے میں زمینیں کرایہ پر دینے کا کوئی دوسرا دستور اس کے سوا نہ تھا۔ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ رہا ایک واضح اور متعین حصہ تو اُس پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

۲ ــــ حنظلہ بن قیس کی ایک دوسری روایت میں رافع بن خدیج کی اس سے ملتی جلتی وضاحت کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ "رہا سونا، چاندی تو اس پر معاملہ کرنے کا اُس زمانہ میں دستور ہی نہ تھا"

۳ ــــ حنظلہ بن قیس کی تیسری روایت میں جناب رافع بن خدیج وہی بات اپنے دو چچاؤں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں ہے کہ "اِس پر میں نے رافع سے پوچھا کہ دینار اور درہم کے عوض معاملہ کرنا کیسا ہے؟ رافع نے کہا: اِس میں کوئی مضائقہ نہیں"

۴ ــــ رافع سے ایک اور روایت حنظلہ الزرقی کے واسطے سے آتی ہے۔ وہ بھی مذکورہ مضمون کے مطابق ہے۔

د ـــ رافع بن خدیج کے چچا زاد بھائی اُسید بن ظُہیرؓ روایت کرتے ہیں کہ:-

"ہم میں سے کوئی شخص جب اپنی زمین سے بے نیاز ہوتا۔ یا اُسے کرائے پر دینے کا حاجت مند ہوتا تو اُسے تہائی یا چوتھائی یا نصف پیداوار کی بٹائی پر دوسرے کو دے دیتا تھا۔ اور ساتھ ہی شرط کر لیتا تھا کہ تین نالیاں اور گانٹھیں[1] (یا گھُنڈیاں) اور بڑی نالی کے کنارے کی پیداوار اُس کی ہے۔ اُس زمانہ میں زندگی بڑی سخت تھی آدمی دن بھر ہل چلاتا یا دوسرا کام کرتا تب تھوڑا سا فائدہ حاصل ہوتا۔ ایک روز رافع بن خدیج ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ایسے کام سے روک دیا ہے جو تمہارے لیے نافع تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت تمہارے لیے زیادہ نافع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو زمینیں کرایہ پر دینے سے منع فرماتے ہیں۔ اور آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو اپنی زمین سے مستغنی ہو وہ یا تو اپنے بھائی کو مفت دے دے، یا یونہی پڑا رہنے دے"۔

یہاں روایت میں صورتِ معاملہ سامنے آگئی ہے اور اُس علتِ ظلم و تشدّد کو سمجھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے حضورؐ نے اس طریق پر زمین کا معاملہ کرنے سے منع فرمایا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ امتناعِ مزارعت والی روایت کے دوسرے نمایاں راوی ہیں، اُن سے بھی لوگوں نے دریافت کیا تو اُنہوں نے جواب دیا:

"ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بٹائی پر زمینیں کاشت کے لیے دیتے تھے اور کچھ گانٹھوں یا گھنڈیوں میں سے، اور کچھ اس چیز میں سے اور کچھ اُس چیز میں سے بھی وصول کرتے تھے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اُسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو کاشت کرائے"

---

[1] روایت میں جو لفظ ہے (قصارَیٰ اور قصرَیٰ) لُغت میں اس کے معنی یہ درج ہیں: بقیۃُ الحبّ فی سنبلٍ بعد ما یُداس۔ یعنی وہ غلّہ جو کھلیان کے بعد بالوں میں بچا رہتا ہے۔ برصغیر میں بعض لوگ اسے "گانٹھ" یا "گھُنڈی" کہتے ہیں۔

ورنہ اپنی زمین پڑی رہنے دے۔

یہاں بھی واضح ہو گیا کہ اصل علّتِ امتناع کیا تھی۔

۷ ـــ حضرت زید بن ثابت جن کی روایت مدعی کے حق میں تھی، اُن سے حضرت عروہ بن زبیر نے معاملہ کی تحقیق کی۔ اُنہوں نے فرمایا:

"خدا معاف کرے رافع بن خدیج کو، میں اس بات کو اُن سے زیادہ جانتا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جن کے درمیان سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، اگر تم لوگوں کا یہ حال ہے تو اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو۔ رافع نے حضورؐ کی بس اتنی بات سن لی کہ "اپنی زمینیں کرایہ پر نہ دیا کرو"

۸ ـــ سعد بن ابی وقاص نے اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے اسی غیر منصفانہ صورتِ مزارعت کا ذکر کیا ہے اور آخر میں کہا ہے کہ "اس پر لوگوں میں جھگڑے ہوئے اور ان کے مقدمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے لگے۔ تب آپ نے ایسی شرطوں پر زمینیں دینے سے منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ سونے چاندی کی شکل میں کرایہ طے کر دو۔"

ابو وقاص کی ایک اور مختصر روایت اسی معنی میں ہے۔

۹ ـــ حضرت طاؤس نے جو فقہائے تابعین میں سب سے زیادہ مشہور ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباس سے معلومات حاصل کیں۔ ابن عباس نے جب کرایۂ زمین کے بارے میں سنا کہ لوگوں میں بہت چرچے گوئیاں ہو رہی ہیں تو انہوں نے کہا "سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی زمین اپنے بھائی کو مفت کیوں نہیں دے دیتا، آپ نے کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا تھا"۔

ابن عباس ہی کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "رسول اللہؐ نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو زمین یونہی دے دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان لے ـــ ایک اور روایت میں یہی بات کہی گئی ہے ـــ تیسری روایت میں عبداللہ ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"حضورؐ نے مزارعت کو حرام نہیں کر دیا تھا، بلکہ آپ نے یہ ہدایت فرمائی تھی

کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا برتاؤ کریں"۔

نتیجہ | اب مدعی پر واضح ہوگیا ہوگا کہ امتناع کی ساری بحث مزارعت کی ایک مروجہ غلط شکل کے خلاف تھی، نہ کہ نفسِ مزارعت کے خلاف ۔ اس شکل سے بے انصافی ہوتی تھی اور جھگڑے پیدا ہوتے تھے ۔ نیز مدعی پر یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور دیگر صحابہ کرام سب نے بٹائی پر زمینیں کاشت کرائی ہیں اور یہ سلسلہ بڑے وسیع پیمانے پر پچاس سال تک بلا روک ٹوک جاری رہا، اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد چند اصحاب نے امتناعِ مزارعت کی روایت بیان کی اور پھر جب اُن سے وضاحت طلب کی گئی تو معلوم ہوا کہ امتناع اُصولی اور کلی نہ تھا۔ بلکہ ایک خاص شکلِ فساد سے روکا گیا تھا ۔ مدعی پر یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی لگان کے بعد زمین دوسروں کو دے دینے کی جو تلقین حضورؐ نے فرمائی تھی وہ اخلاقی فیاضی کی تعلیم تھی نہ کہ قانونی حکم ۔

اور مدعی پر یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ اس طرح کی بحث و تحقیق کے لیے ایسے اخبارات کے کالم موزوں جگہ نہیں ہیں، جو نہ صرف محدود جگہ رکھتے ہیں بلکہ نہایت درجہ وقتی ہوتے ہیں اور ان کے اردگرد کے کالموں کا ماحول دینی اور تحقیقی نہیں ہوتا ۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک وسیع کاروباری ہال کے ایک کونے میں قوالی ہو رہی ہو، ایک میں رقص پیش کیا جا رہا ہو، ایک میں فلم دکھائی جا رہی ہو اور چوتھے کونے میں آپ درسِ قرآن دینے لگیں ۔ مذہب کو کاروباری صحافت کا ایک مالِ تجارت نہیں بننے دینا چاہیے ۔

(بقیہ حقیقتِ تصوف)

شہود یہ کہ تمام موجودات وجودِ حق میں فنا ہیں ۔ کھلے الفاظ میں اُن کے نزدیک خالق اور مخلوق ایک ہی وجود ہے ۔ وہی فی نفسہ واجب ہے اور وہی ممکن ہے ۔ متاخرین نے اس نظریے کو "ہمہ اوست" کے تین الفاظ میں سمو دیا ہے ۔ (باقی)

مطبوعات

تاریخ تصوف از پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۔ شائع کردہ : علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف لاہور
صفحات : ۵۲۲ ، طباعت ٹائپ ، جلد خوشنما ، قیمت : -/۶۰ روپے

یہ کتاب ۱۹۷۶ء کی شائع شدہ ہے ۔ ۵، ۶ سال بعد جب کہ ایڈیشن فروخت ہو چکا ، ایک حلقے نے اس کتاب کے حوالے سے جناب محمد یوسف گورایہ ڈائریکٹر علماء اکیڈمی کو اُن کے منصب سے ہٹوانے اور اپنے فرقے کا آدمی مقرر کرانے کے لیے آواز اٹھائی ہے ۔ معترضین کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں صوفیائے کرام کی توہین کی گئی ۔ یہ توہین کا ہتھیار بھی خوب ہے ، کسی کے خلاف توہینِ انبیاء کا الزام ، کسی کو توہینِ صحابہ کا طعنہ اور کسی پر توہینِ صوفیا کی زد ۔ کیا عجیب سلسلہ ہے ۔ سیدھے طریقے سے نقد و اختلاف کے بجائے " توہین " کا جذباتی نعرہ لگانا اور پھر کتاب کی ضبطی کے ساتھ ناشر کتاب (مصنف نہیں) کو اس کے منصب کے عہدے سے برطرف کرانے کا مطالبہ اٹھانا بہت ہی ٹیڑھا انداز معاملہ ہے ، جو ایک تحقیقی کتاب کے ساتھ کیا جا رہا ہے ۔

یہ کتاب ایک ایسی معروف دینی شخصیت یعنی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی لکھی ہوئی ہے جس کا کام کبھی بھی نہ فرقہ سازی رہا ہے اور نہ فتنہ طرازی ۔ اس کا اقبال اور رومی سے شغف معروفِ عام ہے ۔ اشاعت سے پہلے اِس کتاب کا جائزہ مولانا محمد بخش مسلم نے لیا ہے جو معترضین کے قریبی آدمی ہیں ۔ کتاب کا مزاج تحقیقی ہے اور اس کا ماحصل تقابلی ہے ۔ ہندی اور یونانی تصوّف کو ایک طرف اجمالاً واضح کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے تصوف کو دوسری طرف قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ ائمہ تصوف کے طرزِ فکر اور اُن کی لکھی ہوئی امہات الکتب کے مضامین و مطالب

کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ پھر ہمارے ہاں تصوّف کے دائرے میں جو غیر اسلامی عناصر گھُسے ہیں، اُن کے مقابلے میں اکابر صوفیہ کے افکار ہی کی مدد سے واضح کیا گیا ہے کہ صحیح اسلامی تصوّف کیا ہے۔ بالعموم ائمہ صوفیہ اور اکابر عارفین نے اسلامی تصوّف کو اسلامی شریعت کے دائرے کے اندر رکھا ہے۔ خصوصیت سے اس کتاب کی فصل ششم میں طاؤس الفقراء ابونصر السرّاج (متوفی ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع کا جو خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس سے شریعت کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ سالکین کن مراحل و کیفیات یا تجربات و تصوّرات کے پیش آنے پر کیسے کیسے مغالطوں میں پڑ جاتے ہیں۔ خصوصاً مذکورہ کتاب کے باب ۱۳۶ سے باب ۱۵۲ تک کی تلخیصات بڑی اہم ہیں۔ بہرحال مؤلف نے نہ کوئی کلمہ کفر کہا ہے، نہ دانستہ کوئی شرانگیزی کی ہے۔

اس کتاب سے کسی کو اختلاف ہو تو وہ تحقیقی بنیاد پر اختلاف ضرور کرے، مگر تحقیقی کتابوں کو فرقوں کے نقطۂ نظر سے جانچنا اور اختلاف نظر آئے تو کتاب کو خلاف قانون قرار دلانے کے لیے ایجی ٹیشن شروع کر دینا۔ اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک سرکاری ادارے کے سربراہ کو کتاب کا ناشر ہونے کے جرم میں برطرف کرانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ماڈرن خواتین نے الہدیٰ پروگرام کو بند کرانے کے لیے ایجی ٹیشن کیا۔ فرقہ وارانہ نظریات کی لے اتنی نہ بڑھ جائے کہ علم و ادب اور تاریخ و تحقیق کی پوری سلطنتوں پر ہل چلوا دیا جائے۔ صوفیا اور ان کے پیروں اور مریدوں کا راستہ تو انکسار و لجاجت رہا ہے، احتجاج اور مظاہرے اور دھونس جمانا نہیں۔ اگر یہی ہی دکھانا ہو تو پہلے پرویز صاحب کی کتاب پڑھ لیجیے جو اس کتاب کا ردّ کرنے کے ساتھ ساتھ سرے سے سلسلۂ تصوّف ہی سے ٹکراتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ معاشرے اور حکومت اور محکمۂ اوقاف کا زاویۂ نظر فرقہ وارانہ مزاج سے اتنا غیر معتدل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سرمایۂ علم و تحقیق کو کھلونا بنانے والوں کی خوشنودی کے درپے ہو جائیں۔ اگر ضبطی کی کارروائی کرنی ہو تو یہاں ملحدانہ افکار اشاعت میں آ رہے ہیں، مخالف اسلام نظریات پر لکھا جا رہا ہے، فحش تحریروں اور تصویروں کو فروغ مل رہا ہے مگر اُن کا جو لوگ سرسری نوٹس تک نہیں لیتے وہ ایک تحقیقی کتاب کے پیچھے پڑ گئے ہیں، بلکہ اس کتاب کے کندھے پر رائفل رکھ کر ایک ایسے شخص کا شکار کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے حلقۂ دامِ فتراک سے باہر رہنے کا مجرم ہے۔

اس بات کا خاصا امکان ہے کہ معترضین کے وفود دربار اعلیٰ تک جا پہنچے ہوں۔

آپ اگر اپنے نقطۂ نظر سے کوئی تحقیقی کتاب (نہ کہ قصہ کہانیاں) اس موضوع پر لا سکتے ہوں تو ضرور لائیے، ورنہ پیری مریدی، تعویذ گنڈے، عرس، قوالی، مزارات کے غسل، چادریں اور پھول چڑھانے کے مشاغل موجود ہیں، جن میں بعض ارباب عہدہ و جاہ بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ عوام کے انبوہ کے انبوہ آپ کے ہاتھ چومنے کو تیار ہیں۔ اور کیا چاہیے! اس کتاب کے مصنف یا ناشر یا اس کے مندرجات کی کیا مجال کہ وہ آپ کے حلقوں میں دم مار سکیں۔

مجھے بھی اس کتاب کے اجزا سے اختلافات ہو سکتے ہیں، مگر میں پھر بھی یہ کہتا ہوں کہ پاکستان کے ۳۴ برسوں میں شائع ہونے والی چند توجہ طلب کتب میں سے ایک اہم کتاب یہ ہے اور خصوصاً تصوف کے موضوع پر تقابلی نقطۂ نظر سے ایک قیمتی تحقیق! ایسی چیزوں کی داد اختلاف کرنے والوں کو بھی دینی چاہیے۔ ورنہ کم سے کم ہنگامہ آرائی تو نہیں اٹھانے چاہئیں۔

(اخباری اطلاع کے مطابق اس تحریر کے بعد کتاب بھی ضبط ہو گئی اور ڈائریکٹر علما اکیڈمی بھی برطرف کر دیئے گئے۔ اب کوئی کیا کہے!)

ابولہب | از سرکار زینی جا دچری۔ ملنے کا پتہ: اُردو محل پبلشرز اینڈ سیلرز۔ ۵ سی ۵/۲۴ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸ قیمت: ۱۲/- روپے

یہ کتاب بھی براہ راست تبصرے کے لیے نہیں آئی بلکہ دادو ضلع سندھ سے جناب عبدالکریم صاحب نے بھیجی ہے۔ اور اس کے متعلق استفسار کیا ہے۔

اس کتاب کا ملخص یہ ہے کہ عمِ رسول اللہ ابولہب بن عبدالمطلب حضورؐ کا حامی و سرپرست رہا، یہ صرف خاندانِ رسالت کے افراد کو بدنام کرنے والے سازشیوں کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے سورۂ لہب کا مصداق ابولہب بن عبدالمطلب کو قرار دے دیا۔ احادیث اور اخبار و آثار اور علم اسماء الرجال اور تاریخ کے تمام علوم میں سازش نفوذ کر گئی۔

بہت سی روایات اور واقعات پر کتاب میں بحثیں کی گئی ہیں، مگر سب کھوکھلی ہیں۔ کیونکہ:

۱۔ **اگر** چودہ صدی پہلے کے واقعات و احوال کے ریکارڈ کو غیر حقیقی قرار دے دیا جائے تو پھر کسی بھی نقطۂ نظر کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ بڑے بڑے واقعات اور بڑی بڑی شخصیتوں کے متعلق جو شائع و ذائع آرا قرونِ اُولیٰ سے ایسی چلی آتی ہیں جن کے ساتھ تحریری شواہد بھی موجود ہیں، ان کو مسترد کردینے سے ایسی بڑی خرابیاں واقع ہوتی ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں رہتی۔

۳۔ یہ سوال کہ ابولہب جو حضورؐ کا چچا تھا آخر اسے حضورؐ کی دعوتِ توحید اور شرک کی بنا پر .... حضورؐ کی مخالفت پر اُترآنے کی وجہ کیا ہوسکتی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہی وجہ جو دوسرے بے شمار سرداروں اور ان کے پیروکاروں پر اثر انداز ہوئی، یعنی ایک جمے ہوئے نظامِ فکر و معاشرت کی شکست و ریخت کا خطرہ جس میں قریش کے اکابر کی اعلیٰ حیثیتیں اور مفاد محفوظ تھے۔

۴۔ حضورؐ کی دعوت نہ خاندانی بنیاد پر اٹھی تھی اور نہ اس کا مخاطب و حامی کوئی خاص خاندان تھا۔ نہ مخالف کوئی متعین خاندان۔ ایسا ہوتا تو دوسرے خاندانوں کے لوگ خاندانی عصبیت میں مبتلا رہتے اور کبھی حضورؐ کی طرف نہ کھنچتے۔

۵۔ یہ تصور ہی سرے سے باطل ہے کہ خاندانِ رسالتؐ کا ہر فرد اسلام لائے بغیر ہی ہر قسم کی غلطیوں سے مبرا یا معصوم تھا۔ نہ پہلے کسی پیغمبر کے لیے ایسی ضمانت موجود تھی۔ کہاں نوحؑ اور کہاں پسرِ نوحؑ؟ کہاں ابراہیمؑ اور کہاں آزر؟

۶۔ معروف "ابولہب" کو چھوڑ کر کسی غیر تاریخی شخصیت کو سورہ کا مصداق بنانا، یا اس کنیتی نام کو اسمِ صفت بنا کر ایک طرح کے کردار پر چسپاں کرنا، ایک مناظرانہ سی بات ہے۔ اس میں قرآن پر بھی حرف آتا ہے کہ اُس کی ایک سورۃ مغالطہ کا باعث ہوئی۔ (نعوذ باللہ)

۷۔ جب آپ لفظ سازش کا استعمال کرتے ہیں تو پھر اس کی تحقیقات کیجیے، بتلایئے کب کن اشخاص نے کہاں سازش کی، اسے کس طرح آگے بڑھایا، کس طرح وہ تمام علوم پر اثر انداز ہوگئے، کیوں ان کے خلاف بروقت شور نہ اٹھا اور احتجاج نہ ہوا ــــ جب کہ اور کئی اُمور

ایسے ہیں جن میں تبدیلی آنے ہونے پر ملت کے اکابر و عوام نے احتجاج کیا اور اس کا ریکارڈ موجود ہے۔

افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے تفصیلی بحث کرنا ممکن نہیں۔ یہ اشارات میرے مطالعہ کا ماحصل ہیں۔

مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی جائزہ از پروفیسر سید محمد سلیم۔ ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، پاکستان۔ پتہ: ۸ ملے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور۔ صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: -/۱۲ روپے

پروفیسر سید محمد سلیم کے علم وفضل کی خوشبو تو ہمیشہ پہنچتی رہی، مگر اُن کی دو ایک کتابیں خصوصاً زیر نظر کتاب دیکھنے کے بعد مطالعہ و تحقیق کی ان وسعتوں کا علم حاصل ہوا جو سلیم صاحب کو حاصل ہیں۔ پھر ان کا "کمالِ اجمال" قابلِ داد ہے۔ لمبی چوڑی عبارتوں کے بجائے ایک ایک دو دو فقروں میں بڑے بڑے قصے نمٹا دیتے ہیں۔

یہ مختصر سی کتاب اتنا زیادہ بتاتی ہے کہ اوّل تو ایسی دوسری کتاب کہیں نہ ملے گی اور ملے بھی تو ایک گھونٹ پانی کے لیے پہاڑ کھودنا ہوگا۔ پروفیسر صاحب نے کتابوں کا پہاڑ کھود کر کاسۂ کاغذی میں سمندر بھر دیا ہے۔ خصوصاً تیسرے باب میں (۱۵۰۰ء تا ۱۹۰۰ء) لادینی نظریہ کی فتوحات کے عنوان سے سولہ نکات میں مغرب میں لادین نظامِ فکر کے تجزیہ جزا رتقاء کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ پھر اس فکر سے جو ملحدانہ عالمِ افکار، عالمِ معاشرت اور عالمِ ادبیات ظہور میں آئے ان کے خدوخال بھی "نکتہ بہ نکتہ، مو بمو" بیان کیے ہیں۔ پھر جدید مغرب کی اُن امیدوں اور دعووں کا ذکر ہے جو نظامِ فکر سے پیدا ہوئے۔ آخر میں نتائج ہیں۔ چوتھا باب بھی اسی بحث کا پھیلاؤ ہے۔ پانچویں باب میں لادینی نظریات کو تزلزل کی زد میں دکھایا گیا ہے۔ چھٹے باب میں بتایا گیا ہے کہ دینی تحریک نے تعلیم گاہوں میں گھس کر کس طرح کام شروع کیا۔ پھر تعلیمی اقدار پر اور مقاصدِ تعلیم پر بحثیں ہیں۔ اس طرح مغربی فلسفۂ تعلیم کا جائزہ مکمل ہو جاتا ہے۔

کتاب میں حسب ضرورت حوالے اور حاشیے درج ہیں۔ آخر میں کتب استفادہ کی فہرست ہے اعلیٰ درجے کی تحقیقی کتاب ہے جسے پڑھتے ہوئے لطف محسوس ہوتا ہے۔ نیز اندازہ ہوتا ہے

کہ ہم افکارِ اغیار کے کیسے کیسے حلقہ ہائے دام میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کاش کہ اس کتاب کو ہمارے قومی اکابر، وزراء، کارپردازانِ تعلیم اور اساتذہ وطلبہ بغور پڑھیں۔

سرمایۂ افکار از پروفیسر سید اختر صاحب (فیصل آباد) ناشر: طارق اکیڈمی فیصل آباد

قیمت: مجلد (۱۰۴ صفحات) ۸/- روپے

پروفیسر صاحب ان ذہین جواں ہمت اصحابِ تعلیم میں سے ہیں جو فرائض مفوضہ کے علاوہ مختلف مفید خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان کے قلم سے کئی درسی اور ملی کتب وجود پا چکی ہیں اور پھر ان کی کاوشیں ریڈیائی لہروں پر بھی اکثر سفر کرتی رہتی ہیں۔

سرمایۂ افکار ایک مغربی محقق الفرڈ گیام کے ایک مقالے کے ترجمے پر مشتمل ہے جس میں مسلم فلاسفہ و متکلمین کا تذکرہ ہے۔ مگر بات ترجمے ہی تک محدود نہیں، پروفیسر صاحب نے جابجا تنقیدی و توضیحی حواشی لکھ کر الفرڈ گیام کی فکری لغزشوں کے مقابلے میں حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ اس کتاب کا حصۂ اختتامیہ خود مؤلف نے لکھا ہے اور اس میں مسلمان حکماء و فلاسفہ کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ۱۹ صفحات بڑی افادیت رکھتے ہیں۔ تقریظ اور فلیپ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ کے قلم سے ہیں۔

کربلا سے کابل تک مرتبین: غافل کرنالی و تحسین فراقی۔ ناشر: پاک افغان اسلامی محاذ۔

قیمت: ۲۰/- روپے

یہ مجموعہ ہے اُن نظموں کا جو پاکستان کے حساس اور دردمند شعرا نے لکھی ہیں اور یہ شعرا مختلف سیاسی، سماجی اور علاقائی دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجاہدینِ افغانستان جن کا جہاد خود پاکستان اور عالمِ اسلام کے تحفظ کا جہاد ہے، اس میں غم و درد سے ڈوبے ہوئے لفظوں کے ذریعے شعرا نے اپنے دلوں کی دھڑکنوں کو شامل کیا ہے۔

یہ پمفلٹ اُن صمٌ بکمٌ ادیبوں اور شعراء کی طرف سے ایک کفارہ بھی ہے جو نظریات میں ملوث ہونے کی وجہ سے اپنے ضمیروں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ گھر کے دروازے

کے سامنے ایک ایک ظالم قوت کی تیغ جارحیت کا شکار ہونے والے جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور معصوم بچوں کی چیخوں پر تڑپ سکیں۔

"کربلا سے کابل تک" انسانی احساسات کا ایسا محاذ ہے جس سے جارح قوتوں پر زندہ لفظوں سے فائرنگ کی گئی ہے۔

اخلاقی اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ - مرتبہ: محمد خالد فاروقی۔

شائع کردہ: الاخوان پبلی کیشنز ۲/۱۶ C - ۱ ناظم آباد کراچی۔ صفحات ۹۶، قیمت -/۱۰ روپے

مولانا ابوالخیر مودودی مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں ذکر کیا تھا کہ اُن کے بھائی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اخلاقیات سے متعلق میکنزی کی ایک کتاب کا ترجمہ "اخلاقیاتِ اجتماعیہ" کے نام سے ۲۰ سال کی عمر میں کیا تھا۔ اس مضمون کی پہلی قسط ماہنامہ ہمایوں لاہور کے شمارہ فروری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی - بقیہ اقساط بھی مسلسل چھپتی رہیں۔ خاصی محنت و کاوش سے اس مقالے کو مرتب نے برآمد کیا ہے۔ اب یہ ایک کتابچے کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

اس پمفلٹ کو پڑھ کر آدمی سوچتا ہے کہ آج کل کے ایم اے حضرات کے بالمقابل نصف صدی پہلے کا ۲۰ سالہ نوجوان مودودی نگارش و ترجمہ میں کیا مقام رکھتا تھا۔ دوسری طرف توجہ اس بات پر بھی جاتی ہے کہ شروع ہی سے مولینا مودودیؒ کا ذوق کتنا صحت مند تھا کہ جس کے تحت اخلاقیات کے موضوع کو پسند کیا۔ گو خیالات بعد میں پختہ تر اور وسیع تر اور صحیح تر ہوتے گئے، یہاں تک کہ تحریک اسلامی کے آغاز کے وقت مولاناؒ کے سامنے احیائے اسلام کا ایک روشن راستہ اور اسلامی نظامِ حیات کا ایک واضح نقشہ موجود تھا۔ تاہم دورِ ابتدا میں بھی ترجمہ کے بین السطور میں مولانا کے جو فکری رجحانات جھلکتے ہیں وہ خود کسی حد تک مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

ایک مقالہ جو مولانا مودودیؒ کی تصانیف میں شامل نہ تھا، اس کی دریافت و اشاعت پر مرتب و ناشر کو مبارک باد!

حدِ رجم کی شرعی حیثیت از جناب حافظ صلاح الدین یوسف، ایڈیٹر الاعتصام، لاہور۔ شائع کردہ: دارالدعوۃ السلفیہ۔ شیش محل روڈ، لاہور۔ ۸۸ صفحات۔ خوبصورت ٹائیٹل۔ قیمت: ۵۰/- روپے۔

اجمالی تعارف پہلے بھی ہم کرا چکے ہیں، مگر فاضل مؤلف کو بجا طور پر شکایت رہی۔ پس دوبارہ چند سطور لکھی جا رہی ہیں۔

اِن دنوں چونکہ شرعی حدود و تعزیرات کو قانونی پیرایہ دینے کے لیے کام ہو رہا ہے اس بنا پر حدِ رجم کا موضوع اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ سال ڈیڑھ سال میں اس موضوع پر متعدد مقالات مضامین اور دو ایک مختصر کتابیں نظر سے گذریں۔ پیشِ نظر مختصر کتاب علمی نوعیت کی ہے۔ شروع میں حدِ رجم کی شرعی حیثیت کو مثبت طور پر واضح کرنے کے بعد مؤلف نے حدِ رجم کے مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے تین چیزوں پر تنقید کی ہے۔ اوّلاً ماہنامہ فاران کراچی میں شائع شدہ ایک مضمون پر، ثانیاً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے نظریۂ رجم پر اور ثالثاً ایک ریٹائرڈ جج کے شبہات پر۔ اس طرح گویا سارے ہی مخالفِ رجم نظریات سامنے آجاتے ہیں۔ مخالفین نے عجیب و غریب راستے نکالے ہیں اور بڑی جسورانہ تاویلات کی ہیں۔

ہمارے اِن صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم کتاب کی ساری بحثوں کو سامنے لاسکیں اور ان کا تجزیہ کریں۔ تعارف ہی پر اکتفا کرنا مجبوری ہے۔

ابتدائی گذارشات مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے قلم سے ہیں اور مقدمہ مولانا حنیف ندوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

چند پمفلٹ

پندرھویں صدی ہجری کے تقاضے از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ناشر صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازا۔ لسبیلہ روڈ، کراچی نمبر ۵۔ رعایتی قیمت برائے تقسیم۔ ۲/- روپے

اسلامی معاشرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ (پتہ اوپر درج ہے)

حدِ رجم کی شرعی حیثیت	از جناب حافظ صلاح الدین یوسف، ایڈیٹر الاعتصام، لاہور۔

شائع کردہ : دار الدعوۃ السلفیہ۔ شیش محل روڈ لاہور۔ ۸۸ صفحات۔ خوبصورت ٹائیٹل۔
قیمت : ۵۰/۔ روپے۔

اجمالی تعارف پہلے بھی ہم کرا چکے ہیں، مگر فاضل مؤلف کو بجا طور پر شکایت رہی۔ پس دوبارہ چند سطور لکھی جا رہی ہیں۔

اِن دنوں چونکہ شرعی حدود و تعزیرات کو قانونی پیرایہ دینے کے لیے کام ہو رہا ہے، اس بنا پر حدِ رجم کا موضوع اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ سال ڈیڑھ سال میں اس موضوع پر متعدد مقالات و مضامین اور دو ایک مختصر کتابیں نظر سے گذریں۔ پیشِ نظر مختصر کتاب علمی نوعیت کی ہے۔ شروع میں حدِ رجم کی شرعی حیثیت کو مثبت طور پر واضح کرنے کے بعد مؤلف نے حدِ رجم کے مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے تین چیزوں پر تنقید کی ہے۔ اوّلاً ماہنامہ فاران کراچی میں شائع شدہ ایک مضمون پر، ثانیاً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے نظریۂ رجم پر اور ثالثاً ایک ریٹائرڈ جج کے شبہات پر۔ اس طرح گویا سارے ہی مخالفِ رجم نظریات سامنے آجاتے ہیں۔ مخالفین نے عجیب و غریب راستے نکالے ہیں اور بڑی جسورانہ تاویلات کی ہیں۔

ہمارے اِن صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم کتاب کی ساری بحثوں کو سامنے لاسکیں اور ان کا تجزیہ کریں۔ تعارف ہی پر اکتفا کرنا مجبوری ہے۔

ابتدائی گذارشات مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے قلم سے ہیں اور مقدمہ مولانا حنیف ندوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

——— چند پمفلٹ ———

پندرھویں صدی ہجری کے تقاضے	از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ناشر صدیقی ٹرسٹ

نسیم پلازا۔ لسبیلہ چوک، نشتر روڈ، کراچی نمبرہ۔ رعایتی قیمت برائے تقسیم۔ ۲/۔ روپے

اسلامی معاشرت	مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ (پتہ اوپر درج ہے)

(بقیہ اشارات)

جا رہا ہے۔ اگر یہ صورت جاری رہی تو لوگ آہستہ آہستہ اسلام سے مایوس اور شکارِ انتشار ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت ہی ماہرانہ نقشۂ جنگ ہے جو لادینیت پسندوں نے بنایا ہے کہ اسلام کے گلے پر چھری چلاتے ہوئے اسلام ہی کا نام لیا جائے۔

اس پالیسی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ بیگمات ہیں۔ مغربی تصوّر یہ ہے کہ اگر عورت ایک مرتبہ لادین تہذیب کی پیدا کردہ معاشرت کے طلسم میں مبتلا ہو جائے تو پھر وہ ایسے فتنۂ ہائے قلب و نظر کا سامان بن سکتی ہے کہ اسلام کی قدریں کبھی جگمگا نہ سکیں۔ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے خداوندوں کو مسلمان عورتوں کا برقع تو کیا، اُن کا چادر یا دوپٹہ اوڑھنا بھی خطرے کا نشان معلوم ہوتا ہے۔ جہاں جہاں مغربی تنظیموں نے سرکاری یا غیر سرکاری مدارس کھول رکھے ہیں، وہاں وہ انگریزی یا کسی دوسری مغربی زبان کی برتری اور مغربی آداب و اطوار کے فروغ کا اہتمام کرنے کے ساتھ مسلمان بچیوں کو اپنے مدرسوں میں لیتے ہوئے چادر دوپٹے سے آزاد کرانے کی مہم میں لگی ہوئی ہیں؛ بلکہ اصل کوشش یہ ہے کہ وہ ان کو کھلے سینوں اور کھلے بازوؤں کے ساتھ سگرٹ کا عادی بنائیں۔

اِدھر ہمارے سیکولر طبقے کے اکابر اور ان کی بیگمات کا حال یہ ہے کہ وہ بصد مسرت بھاری اخراجات ادا کر کے اپنے بچوں بچیوں کو اُن کے حوالے کرتے ہیں کہ ان کو اتنا بگاڑ دو کہ اسلام اُن کے لیے اجنبی بن جائے اور یہ اسلام کے لیے اجنبی ہوں۔

کیا ہمارے ہاں کی ترقی پسند خواتین اور دوش بدوش قسم کی بیگمات کے ماتھے پر کبھی کوئی سلوٹ ان غیر ملکی مدارس کے خلاف بھی پڑی۔ ایجی ٹیشن تو دُور کی بات ہے۔ مجھے تو اندیشہ یہ ہے کہ اگر بحث چھڑے تو شاید ہماری روشن خیال خواتین یہ کہیں کہ اصل اسلام تو ہے ہی وہی جو ملحدانہ مغربی تہذیب و معاشرت اور مسیحی مذہب کو پھیلانے والے یہ مدارس کر رہے ہیں۔ باقی جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب تو ملائیت ہے۔ ہر غلط بحث کا لٹھ ملّا کے سر پہ توڑنا ضروری ہے۔

تو کہنا یہ تھا کہ یہ فیصلہ کُن تاریخی کشمکش جسے قرنوں سے پسنے والے مسلمانوں کی نوجوان نسلوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے چھیڑ رکھا ہے، اس میں خواتین مخالف محاذ کی طرف سے استعمال ہو رہی ہیں۔ کاش انہیں اس کا شعور ہو جاتا۔ بصورت دیگر ملّتِ اسلامیہ نے اپنے احیا کے لیے صدیوں سے جو جتن کیے ہیں، آپ کا رویہ ان سب کو ملیامیٹ کر دے گا۔

جو لوگ تاریخ رواں کا وسیع افق سامنے رکھ کر سوچتے ہیں، وہ پردے سے گریز اور مخلوط تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں کی علمبردار خواتین کے پارٹ کا جب تجزیہ کرتے ہیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ مشہور مغربی وقائع نگار خاتون اوریانا فلاسی کے مزاج کے مطابق ہو رہا ہے۔

اِن گذارشات کو پیش کرتے ہوئے میری دلی تمنا ہے کہ ماڈرن خواتین کسی مفسر کی ذات اور ٹیلی وژن کے کسی خاص پروگرام کے خلاف بحث اُٹھانے کے بجائے اپنے مقام و موقف کا بہ نگاہِ خود تنقیدی جائزہ لیں۔
یہی صلاح و فلاح کی راہ ہے۔

تحریکِ اسلامی کے مراحل

از: سید اسعد گیلانی

- ○ اسلامی تحریکوں کی قوت کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے۔
- ○ تحریکوں میں انفرادی اور اجتماعی امراض کون سے پیدا ہوسکتے ہیں
- ○ تحریکی امراض سے بچنے کی تدابیر کیا ہوتی ہیں
- ○ دعوت کا نورِ فہم کی روشنی اور جذبے کی توانائی کیونکر حاصل ہوسکتی ہے
- ○ تحریک کا قافلۂ سخت جان منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے کن کن مراحل سے گزرتا ہے۔
- ○ دورِ حاضر میں اسلامی تحریکوں کےلیے کامیابی کا راستہ کون سا ہے
- ○ فکر کی روشنی اور عمل کی بیداری کیونکر پیدا ہوسکتی ہے۔

اسی نوعیت کے تربیتی موضوعات اِس کتاب میں زیرِ بحث ہیں

تحریکی کارکنوں کیلئے تربیت اخلاق و کردار کی بہترین گائیڈ بک

ضخامت: ۱۶۰ صفحات، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۱۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

علماءِ دین! —— علماءِ طب —— بنئیے!!

—— اور ——

ایک باعزت، موثر اور مفید —— "ذریعہ معاش" جو
دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ
بھی ہے —— اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

الحمد للہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم
کر لیا گیا ہے —— اور

جامعہ طبیہ اسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور اوسط یا متوسط درجہ سے فارغ
ذہین طلبہ —— کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات
کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں
بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و
اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف —— ۳۷۵ جناح کالونی فیصل آباد